# تجاوُز



غلام حسین ساجد

تجاوز

غلام حسین ساجد

اپنے فطری مگر پُراَسرار اُسلوبِ نگارش کو اساطیری لحن سے منوّر، معطّر اور مطہّر کرتے غلام حسین ساجد کو ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ اس کے اختراعی اندازِ بیاں اور متنوع استعارات نے شعروشاعری کی فضا ہی بدل کر رکھ دی ہے۔ اس کا کمال یہ بھی ہے کہ اپنے جداگانہ طرزِ اظہار کے تسلسل اور ماحول کو برقرار رکھتے ہوئے بہت سے نئے خیالات کے ساتھ بار بار ہماری حسّیات کو جگاتا اور مہمیز کرتا رہتا ہے۔

غلام حسین ساجد کے مجموعے ''تجاوز'' سے میرے اِس تاثر کی تصدیق بلکہ توثیق ہوئی ہے کہ اس کے تخلیقی امکانات وقت کے ساتھ ساتھ کم ہونے کی بجائے نئے سُروں میں جلوہ گر ہوتے رہیں گے۔

پہلے بھی ساجد کی تیر اندازی، تیغ زنی، شہسواری، درباداری، تاج وتخت، فتح و شکست کے تلازمے ستّر کی دہائی کے شعرا کے غالب رجحان کے آئینہ دار تھے اور اِس مجموعے کی شاعری بھی اِسی طرح کی معنویت اور مقتضیت سے اثر آفریں ہے۔ وہ اِس عہد کے ایک آدھ شاعر کی طرح محرّر نہیں، بھرپور شاعر ہے۔ اِس کی رمزیت مجرّد نہیں معنی خیز اور تہ دار ہے۔ وہ فقط تصویر نہیں کھینچتا، فقط منظر نگاری نہیں کرتا، مہ جبینوں کی دل رُبائی اپنے چشم ودل سے گزارتا ہے اور اپنے تنِ طنبور سے نئے سُر ترتیب دیتا ہے، انوکھی دُھنیں تراشتا اور اُنھیں الفاظ کے سازوں سے سنوارتا اور نکھارتا ہے۔ جب جب کوئی جوہری جامد اور مضمحل شعروں کے خزف دِکھا کر گہر کی مثال پوچھے گا تو غلام حسین ساجد کے اشعار جواب میں سنا کرے گا۔ ساجد اُردو شاعری میں شاعر، شعری متن اور شاعری کی قرأت کے مابین حُسنِ توازن اور توازنِ حُسن کی ایک نادر مثال ہے جو نک سک سے بھی بھلی لگتی ہے اور اطوار و آداب سے بھی۔

ساجد ایک مکمل شاعر ہے۔ اِس نوع کے شعرا ہمارے ہاں کم ہی نہیں بہت کم ہیں۔ اس کی شاعری کے ہر آئندہ مجموعے کا ذائقہ پچھلے مجموعے سے الگ ہوتا ہے۔ یوں ''تجاوز'' کی غزلیں اس کی فطرت پسند معروضیت کے ساتھ ساتھ اِسی مزاج کی خیال آرائی سے مزین ہیں۔ فطرت پسندی کی اِسی رو میں وہ اپنی تمام حسّیات، لامہ، شامّہ، باصرہ، ذائقہ، سامعہ کو بروئے کار لاتا ہے۔ ''تجاوز'' کی شاعری ان حسّیات

(جاری)

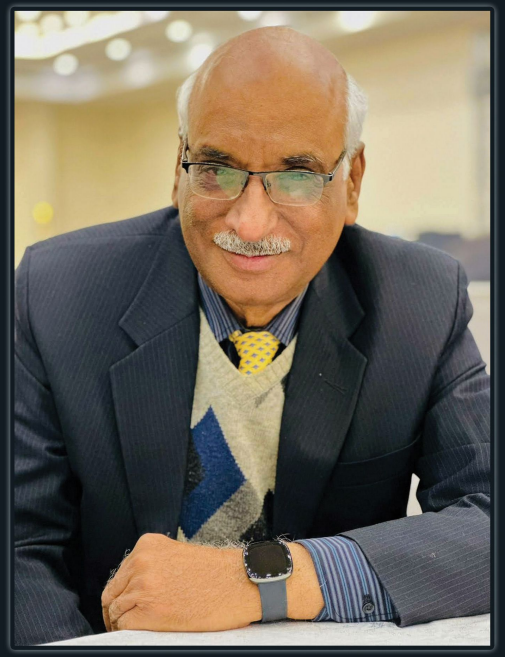



Rang-e-Adab Publications

Office # 5 - Kitab Market, Urdu Bazar, Karachi.

0345-2610434 | 0336-2085325

021-32761100 | 0300-2054154

rangeadab@yahoo.com | /rangeadab

Rs: 800/-

9789697451142

کے ذہنی، روحانی اور جسمانی مگر غیر محسوس تجربات کی دل نشیں عکاسی ہے۔ ''تجاوز'' کی فطرت پسندی شعری حقیقت نگاری کے قریب قریب پہنچتی ہے۔ جس سے ذات، حقیقت اور منطق پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس کی غزلوں میں شعری جمالیات اور صنعت گری کے ساتھ علامتی نظم وضبط بھی آمیخت اور متخیلہ بھی باہم آمیز ہوتی رہتی ہیں۔ اِسی تناظر اور اِنھی مظاہر سے ''تجاوز کی شاعری کے متناسب اور متجاوز ایوان کی خشت در خشت تعمیر ہوئی ہے۔ فطرت نگاری ہر طرح کے شعری اور نثری متون میں منعکس ہوتی ہے۔ الہامی کتب کے اسلوب میں فطری اور فطرتی حرکی اور غیر حرکی مظاہر اور مناظر کی فراوانی ہے۔ مغربی شاعروں میں حسّیاتی فطرت یا فطری حسّیات کے مضامین تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ مشرقی حسّیات کے زاویے اور جہات مغربی فطرت نگاری سے ملتے بھی ہوں مگر الگ سے پہچانے بھی جاتے ہیں۔ ''تجاوز'' کے شاعر کی فطری حسّیت مشرقی ہے مغربی نہیں۔ یہ فرق ''تجاوز'' کے کلام کی قرأت میں آپ کو محسوس ہونے لگے گا، کیوں کہ اس مغربی تجاوز میں مشرقی گریز کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔

''تجاوز'' کے شعروں میں سِتار اور گٹار کے کھنچے ہوئے تاروں کی سنسناہٹ بھی ہے اور دھیمی، بلند تال، تان اور الاپ کی گنگناہٹ بھی۔ ساجد جب گیتوں سے بھر جاتا ہے تو ہی گنگناتا ہے۔ گزشتہ کلام کے انتخاب میں کچھ نئی غزلیں شامل کر کے نیا مجموعہ مرتب نہیں کرتا۔ اس تازہ مجموعے میں وہ اپنی حسّیاتی وفور کی تھاپ پر اپنے انداز میں رقص کناں ہے۔ ''تجاوز'' ایک فطری شاعر کی شاعری ہے۔ مگر فراریت، حزن، ملال، یاسیت، غصے سے کم وبیش پاک ہے اور اس میں ایک دل نشیں لبھانے والی لپک ہے۔ معاملاتِ عشق وخرد میں ایسے مرحلے، وقوعے، نشیب اور فراز آتے ہیں جو اجتماعی اور انفرادی اُداسی پیدا کرتے ہیں۔ ان کی باطنی اور ظاہری عکاسی تو ساجد کے ہاں ملتی ہے مگر ان کا نتیجہ یا ردِّعمل انفعالی نہیں ہوتا۔ منفعل دراصل متجاوز نہیں ہوتا یا نہیں ہو سکتا سو ساجد کی شاعری میں نشاطیہ کیف روز افزوں ہے۔

خالد اقبال یاسر

۷/ جون ۲۰۲۳ء

# تَجاوُز

(غزلیں)

غلام حسین ساجد

رنگِ ادب پبلی کیشنز

1

نگرانِ اشاعت
**شیرازی شاعر**
**0300-2054154**

جملہ حقوق بہ حقِ شاعر محفوظ ہیں

کتاب : تَجاوُز
(غزلیں)

شاعر : غلام حسین ساجِدؔ
**0300-4423457**

سرورق : پروفیسر ڈاکٹر محمود ناصر ملک

اشاعت : 2023ء

ناشر : رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی
**0345-2610434**
**rangeadab@yahoo.com**
**www.facebook.com/rangeadab**

ISBN # 978-969-745-114-2

پبلی کیشن کی جدید ٹیکنالوجی کے مطابق کتاب کی اشاعت کے لیے رابطہ کیجیے:

**رنگِ ادب پبلی کیشنز**
آفس نمبر 5- کتاب مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی





دِیا (عدیلہ زُبیر)

اور

جِی جِی (شرجیل احمد)

کے نام

# مزامیر


✍ شاعرانہ عکس کاری کے متنوع سانچے — سعادت سعید — 9


## غزلیں


۱۔ جسم کی خوشبو الگ ہے، عطر کی خوشبو الگ — 15
۲۔ خواب کی دنیا الگ ہے، نیند کی دنیا الگ — 16
۳۔ مختلف میری بصیرت ہے نہ بینائی الگ — 18
۴۔ آبِ آئینہ الگ ہے، آنکھ کا پانی الگ — 20
۵۔ قیس کا قصہ الگ ہے، میرا افسانہ الگ — 21
۶۔ بستر لگا ہوا، نئی چادر بچھی ہوئی — 23
۷۔ سُنائی دے ہے پلٹ کر مری صدا مجھ کو — 25
۸۔ آئینہ دھوپ سے گُلِ اخگر بنا ہوا — 27
۹۔ قریب لا کے اُسے، حرزِ جاں بنا کے اُسے — 29
۱۰۔ بدن کی سیر نہ گردن کا مَس ضروری ہے — 31
۱۱۔ کوئی کر سکتا ہے تفریق کہاں ہم تم میں — 33
۱۲۔ جب سے وہ چاندسی صورت مرے آئینے میں ہے — 35
۱۳۔ نظر بہکنے لگی، جسم تھرتھرانے لگا — 37
۱۴۔ جبیں سے ہوتے ہوئے نقشِ پا تک آیا ہوں — 39
۱۵۔ بدن کا لوچ، رفاقت کا حُسن کیا کہنے! — 41
۱۶۔ زلف کی مہکار، آنکھوں کی چمک اوڑھے ہوئے — 42
۱۷۔ بدن چُراتے ہوئے اُس نے جب چُرائے ہونٹ — 43
۱۸۔ خواب دیکھا ہی نہیں، نیند چُرائی ہی نہیں — 44
۱۹۔ گُریز کرتے ہوئے اس سے دُور ہوتے ہوئے — 46

۲۰۔ کسی کے بوسۂ شیریں کا دھیان آتے ہی 48

۲۱۔ بھرا نہیں ہے مِری روح کا خلا اب تک 50

۲۲۔ رنج سے باخبر بھی ہو، غم بھی ہو کم سے کم اُسے 52

۲۳۔ اُس کے قریب تو نہیں، پھر بھی وہیں کہیں ہیں ہم 54

۲۴۔ نقش بُجھے بُجھے ہوئے، عکس دُھلا دُھلا ہُوا 55

۲۵۔ دلبری کا رنگ کیا ہے، رُوپ کا جادو ہے کیا 56

۲۶۔ آپ کے حُسنِ نظر کا والہ و شیدا بنوں 58

۲۷۔ حُسن کے گھایل الگ پڑے ہیں، باتوں کے نخچیر الگ 59

۲۸۔ سوچیں تو آس پاس ہیں، دیکھیں یہیں کہیں ہیں ہم 60

۲۹۔ طلسمِ کُن سے مِرا سلسلہ وہی ہے ابھی 62

۳۰۔ ہَوا میں اُڑتے ہوئے، پانیوں میں بہتے ہوئے 64

۳۱۔ عشق آساں نہیں ہوتا ہے غزل خوانی سے 65

۳۲۔ آوارگی کا بوجھ اُٹھانے سے فائدہ 67

۳۳۔ نظر جھکائی ہوئی، آئنہ ہٹایا ہُوا 69

۳۴۔ دِیا چراغ پہ، آئینہ خواب پر مامور 71

۳۵۔ آتشِ غم کی حرارت ہی نہیں محسوس کی 72

۳۶۔ کہیں چراغ جلایا، کہیں بُجھایا گیا 74

۳۷۔ کوئی پتّھر ہٹایا نہیں جا سکا، کوئی دیوار سر سے بلند آ گئی 76

۳۸۔ مِری نظر میں بہت احترام ہے اُس کا 77

۳۹۔ کسی پری سے ملاقات کر رہا تھا مَیں 79

۴۰۔ گلی میں خاک اُڑی، آئنے پہ گرد پڑی 81

۴۱۔ اپنی تلاش میں کہیں خود ہی کو کھو رہے ہیں ہم 82

۴۲۔ ہاتھ بہت بے تاب تھے لیکن چنچل پوریں شرمائیں 84

۴۳۔ آئینے کو آنکھیں بخشیں، مٹّی کو بینائی دی 85

۴۴۔ مان جائے گی اگر وہ جل پری رُوٹھی ہوئی 86

۴۵۔ بے گانگی کا قرض ادا ہی نہیں ہُوا 87

۴۶۔ فصل بڑھنے لگی گُلِ نَے کی 89

۴۷۔ پانی کا رنگ طے ہُوا مٹّی کے رنگ سے 90







۴۸۔ صاحبِ بزم طریقت ہے، کوئی راز ہے وہ 92

۴۹۔ مَیں نے اپنا غم نہیں بانٹا کسی ہم راز سے 94

۵۰۔ کلام کرنے کی حاجت نہیں نہ اب ہو گی 96

۵۱۔ ہُوا ہے طرزِ تغافل سے کیا، کسے معلوم 97

۵۲۔ نیند سے باہر نکلوں گا اور خواب کے اندر دیکھوں گا 99

۵۳۔ وہ دُور چلا جائے گا، سوچا ہی نہیں تھا 100

۵۴۔ اُس پری کے مدار میں ہیں ہم 102

۵۵۔ ماتھے پر ہے مُہرِ غلامی، دل میں داغ اسیری کا 104

۵۶۔ روشن کیا ہے خواب نگر اُس چراغ نے 105

۵۷۔ آگ سے کھیلنے والوں کوئی مجھ سا کہاں 106

۵۸۔ کتابِ عشق مکمّل ہوئی نہیں بھی ہوئی 107

۵۹۔ مجھ سے تعظیم چاہتا ہے میاں 109

۶۰۔ ہَوا چلنے لگی ہے، کم ہوئی آزردگی میری 112

۶۱۔ چراغ اُڑنے لگے، آئنے سنورنے لگے 114

۶۲۔ کسے ہے شُبہ تمہارے حَسین ہونے میں 115

۶۳۔ فشارِ ذات ہے اور جاگنا قیامت ہے 116

۶۴۔ اُس پری وش سے کبھی آنکھ مِلاتے ہی نہیں 118

۶۵۔ کہاں اب مُنہ چُھپائے گا ادھورا پن ہمارا 120

۶۶۔ ہے مِرے گمان میں کیا بسا کوئی خواب ڈھوتا ہُوا بدن 122

۶۷۔ تری سپنوں بھری صورت، تری بے خواب آنکھیں 123

۶۸۔ وہ جب سے مہربان ہُوا، اِس غلام پر 124

۶۹۔ ماتھے پہ نام ثبت ہے، آنکھوں میں کچھ خمار سا 126

۷۰۔ اجنبی لگ رہا ہے ہر اک راستہ تم سے مِل کر مجھے 128

۷۱۔ جہاں تم پائے جاتے ہو، وہیں ہوتا ہوں مَیں بھی 129

۷۲۔ آئنے میں عکسِ حیرت کو سمانا ہی نہیں 131

۷۳۔ ہم تو بے خود ہیں ایک ہی کش میں 133

۷۴۔ اُس پری زاد کا کنایہ کیا 134

۷۵۔ سحر ہوتے ہی دنیا کے رگ و پے میں اُتر آئی 136

۷۶۔ سر کھپاتا ہی نہیں نیند کی تیاری میں 137
۷۷۔ موجِ وحشت نے عجب آگ لگائی ہوئی ہے 138
۷۸۔ کام مشکل ہے مگر انکار بھی کر دیکھیے 139
۷۹۔ ہونٹ ہونٹوں پہ، ہاتھ ہاتھوں میں 141
۸۰۔ پہلے تو آبِ نور سے مَیں باوضو ہُوا 143
۸۱۔ کسی چراغ سے مَس ہو گیا بدن میرا 144
۸۲۔ نہ کوئی فرق پڑے گا کسی کو کھو کر بھی 146
۸۳۔ فضا خوشبو سے خالی ہو رہی ہے اور گھر تُم سے 147
۸۴۔ خواب تھی قربت ہماری، قدر افزائی بھی خواب 149
۸۵۔ خواب آتے ہیں کہاں ایک زمانے سے مجھے 150
۸۶۔ نرم لبوں سے گرم زباں تک 151
۸۷۔ اُڑا دیں عشق نے نیندیں ہماری 153
۸۸۔ وقت کا زیر و بم سمجھتا ہوں 154
۸۹۔ کبھی چراغ جلاتا، کبھی بُجھاتا ہوں 156
۹۰۔ وحشتِ دل کا تقاضا ہے کہ گریہ کیجئے 158
۹۱۔ خواب کی دھوپ کہاں، نیند کی بستی ہے کہاں 160
۹۲۔ ہاتھ میں دشمن کے شاید مَیں کماں دیتا نہیں 162
۹۳۔ میسّر وہ گلِ راحت نہیں کیا 164
۹۴۔ تمہاری یاد سے جب درگزر کیا مَیں نے 166
۹۵۔ اِک شہرِ طرب ناک سے گاتا ہوا گزروں 168
۹۶۔ لہو میں ڈوب گیا ہجر کا خمار اگر 169
۹۷۔ گناہ کرتا ہوں اور نیکیاں کماتا ہوں 170
۹۸۔ محفل میں اُس چراغ کی آیا ہُوا تھا مَیں 171
۹۹۔ روشنی سہمی ہوئی، آئنہ تھرّایا ہُوا 173
۱۰۰۔ دوڑتی ہے اُس کے ماتھے پر اگر کوئی لکیر 175


◆◆◆





# شاعرانہ مگس کاری کے متنوع سانچے

ڈاکٹر سعادت سعید

غلام حسین ساجد اُردو اور پنجابی کے سنجیدہ فکری مزاج کے حامل شاعر اور ادیب ہیں۔ اُنہوں نے دونوں زبانوں میں اپنے تجربات و افکار کو خوش اُسلوبی سے منتقل کیا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے ودیعت کردہ مسائل و معاملات کی فہم سے متصف شعر و ادب میں اپنی انفرادی شناخت بنا چکے ہیں۔ اُنہیں کئی معاصر شاعروں کی طرح اپنے عہد کی بے ثمری کا مستقل احساس رہا ہے۔ زمانے کی نمبولیوں سمان تلخیوں نے انسان کو آلیا ہے۔ اسے جس مٹھاس یا قند یا شہد کی تلاش ہے وہ نایاب ہے، چہار طرف ایک خالی پن ہے۔ یوں لگتا ہے جنازوں پر ماتم کرنے والے لوگ اپنے اپنے گھروں کو سدھار چکے ہیں اور چاروں طرف ہُو، سناٹے اور ویرانی کا عالم ہے۔ ایسے میں اگر کوئی شاعر نیند کی دنیا آباد کرے اور اس میں بسی بستیاں دیکھے۔ خوش منظریوں سے معانقے کرے۔ اپنے ہونٹوں سے مردہ ماحول کی بے حس دوشیزہ کے اندر زندگی کی رمقیں پیدا کرے تو اُسے اِس کے اِس حق سے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ شاعر کے اندر کا بنجر پن ہو یا باہر کا اُسے جن بوندوں سے سیراب ہونا ہے اُن کی تلاش کا عمل کبھی نہیں رکتا۔ منٹو نے جن طوائف خانوں کی کہانیاں لکھی ہیں اور غلام عباس نے جس چکلائی تواتر اور بازار بساؤ کی باتیں کی ہیں ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں کسی نہ کسی طور اُن کی نشاندہی کی ہے۔ غلام حسین ساجد نے بھی بدمعاش معیشتی کے نتیجے میں اپنی تہذیب کو نذرِ آتش ہوتے دیکھا ہے۔ یوں کمرشل پلازوں، ایمپوریم مالوں، تجارتی دلال خانوں کی بہتات کا سلسلہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ ان کی وجہ سے بالا خانوں کی رونقیں بڑھائی جا رہی ہیں۔ جو معاملے تہذیبی قدروں کے راسخ ہونے کی وجہ سے حدود آشنا تھے وہ سب کے سب حدوں سے باہر لائے گئے ہیں۔ ایسے میں انفرادی تجاوز کے ساتھ ساتھ سماجی تجاوز کے رنگوں بھرے سلسلے دیدہ افروز ہو رہے ہیں۔ یعنی ''اُنھّی پئی ہوئی اے'' اور وہ آنے جانے والوں کو دعوتِ عام دے رہی ہے۔ نئی سامراجی تہذیبی یلغار میں ہر نوع کے ذاتی، سماجی، معاشی اور سیاسی تجاوزات کو روا رکھا گیا ہے۔ حیوانی شہوانی اور شہوانی حیوانی کے تہ بہ تہ استعاراتی و علامتی سلسلے قامبند ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ فکشن کے نام پر سامنے آنے والے سلسلوں میں بھی زنا آشوئی کے تجاوزی سلسلے موج نمائیاں کر رہے ہیں۔ ایسے میں شاعر نیند اور خواب کے مدھ بھرے آئینوں میں گُم رہنے میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔

غلام حسین ساجد نے واضح اعلان کر رکھا ہے کہ اُن کی تہذیب کی نسبت اُن کی مٹّی سے ہے۔ یہ تہذیب بصیرتی بصارتی اوصاف سے معمور ہے۔ اِس لیے اِس تہذیب کے دائروں میں سفر کرتے شاعروں کی ''چپ سمندر'' ہوتی ہے اور بات قیامت! شاعر زیرِلب خموش لفظوں کے شور کو سن سکتا ہے۔ اُسے وہ سب کچھ کہہ گزرنا ہوتا

ہے جو اُس کے من میں سماتا ہے۔ وہ جذبوں کے نیلے پانیوں میں عکس در عکس اُتر سکتا ہے۔ یوں جس نوع کی حیرانیاں اُس کے سامنے آتی ہیں وہ آئینوں کو مات دے دیتی ہیں۔ اِس کے لیے قرب و بعد کے معاملے حل شدہ ہوتے ہیں۔ کسی سے دور رہ کر اس کے پاس ہونا اور پاس ہو کر دور ہونا اس کی تصوراتی دسترس میں ہے۔ اس کی ذات کے مدھ بھرے آئینے اسے عالمِ مدہوشی میں ہوش میں لا سکتے ہیں۔ یوں وہ اپنی رنج کو رقص بناتی وحشتوں کے روبرو آ سکتا ہے۔ شاعر اپنے دل کے آئینے میں جھانک کر حقیقت یابی کرنے کا اہل ہوتا ہے۔ اس کا یہ عمل اسے صوفی دانش کے قریں لاتا ہے۔ یوں اس کی ہم کلامیاں حلاج، شمس تبریز، اور سرمد سے ہو سکتی ہیں۔ یہ عمل اسے خاکساری پر قانع کرتا ہے۔ ایسے میں اس کی انا شکنی امرِ لازم ہوتی ہے۔ سفرِ ذات اور کائنات گردی اس کا مقدر بن جاتے ہیں۔ جو وہ سوچتا ہے وہی اس کے سامنے آ سکتا ہے۔ اسے لگتا ہے وہ تابندہ بصارتی کا جوہر رکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں محافظ بن کر رات دن اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ یوں وہ کسی ایسی ہستی کا ادراک کر سکتا ہے جو داور حشر اور صاحبِ ایجاد کہلاتی ہے۔ یہ عمل اسے احساس دلاتا ہے کہ وہ محفوظ ہے، اس کا دشمن اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ زمانے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے والی غیرت سے متصف ہو جاتا ہے۔ غلام حسین ساجد کی ایک غزل ملاحظہ ہو:

شمع خیالِ سبز کی رنگ جما نہیں رہی — خواب کہاں سے آئے گا، نیند تو آ نہیں رہی
عالمِ آب و خاک سے کوچ کا وقت آ گیا — یعنی چراغ بُجھ چکے، یعنی ہَوا نہیں رہی
باغِ نشاط کی طرف اپنے قدم نہیں بڑھے — جب سے ہمارے کھوج میں بادِ صبا نہیں رہی
کیسی عجیب بات ہے اُس کے بدن کی دھوپ بھی — چھاؤں بچھا نہیں رہی، آس جگا نہیں رہی
ختم ہُوا مناقشہ مجھ سے مِرے وجود کا — آبِ بقا کے روبرو موجِ فنا نہیں رہی
لپٹی ہوئی ہے روح سے کوئی عجیب سی خوشی — آج کسی کی یاد بھی آنکھ چُرا نہیں رہی
داغِ فراق دے گئی درد کی آخری کرن — اب سے مِرے نصیب میں نقدِ وفا نہیں رہی
آج نمازِ فجر کے سایے میں آنکھ لگ گئی — جاگا تو میرے ذہن میں کوئی دُعا نہیں رہی

شاعر کی آنکھ ایسی طوطی کی آنکھ ہے کہ جس کے مقابل شش جہتی آئینے ہوتے ہیں۔ ان آئینوں کو جب چراغوں کی روشنیاں مہیا کی جاتی ہیں تو ان کے اندھیرے عکس بھی لو دینے لگتے ہیں۔ شاعر کے پاس اگر اپنی بصیرتوں کے یکساں چراغ ہوں تو ایک گونہ بیزاری کے ساتھ ساتھ فکری اور جذباتی انجماد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں اس کے دل میں رستوں کے ساتھ ساتھ چراغ بدلنے کی تمنائیں بھی جنم لیتی ہیں۔ ان تمناؤں میں اگر بوقلمونی بھی ہو تو پھر اس کے دل کے چراغوں کا تیز ہواؤں کی زد میں آنا بھی قابلِ فہم نکتہ ہے۔ غلام حسین ساجد کے نئے اُردو شعری مجموعہ کا نام ''تجاوز'' ہے۔ اس عنوان کی داخلی جہت کی طرف توجہ قاری کو باور کر سکتی ہے کہ کوئی ایک حد یا حدیں ہیں جن سے تجاوز ہوا ہے، ہو رہا ہے، ہو سکتا ہے۔ یہ حدیں انفرادی بھی ہو سکتی ہیں اور اجتماعی بھی۔ سینۂ شمشیر سے شمشیر کے دم کا باہر ہونا اس کے تجاوز کا عکاس ہے۔ شاعری میں جذبۂ بے اختیارِ شوق کا بیان بھی تجاوزی نفسیات کا مظہر ہے۔ کائنات، فطرت، اور سماج کی جانب سے اچانک نازل ہونے والی آفات کو بھی حد



تجاوزی سے تعبیر اجا سکتا ہے۔ تاہم غلام حسین ساجد نے اپنے اُردو اور پنجابی ادب میں، اپنے اِرد گرد موجود فرد اور سماج کے سیاق و سباق میں، اپنے فکری، معنوی، کیفیاتی اور جذباتی تجاوزات کی عکاسی سے کبھی کنارہ کشی نہیں کی۔

عمومی سماجی اخلاقیات پر روایتی اقدار کی مضبوط گرفت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اس میں انسانوں کو تقدیر کے ہاتھوں بے بس قرار دیا گیا ہے۔ انہیں کہا گیا ہے کہ وہ ہر نوع کے ستم یا ظلم کے آگے سینہ سپر نہ ہوں۔ صبر، توکل، عاجزی، خاکساری اور سرِ تسلیم خم کرنے کی عادات پر قانع رہیں۔ کسی غریب کے سر پر دیوار گرتی ہے تو گرے اسے فریاد کی اجازت نہیں ہے۔ اس کی فریاد قناعتی نفسیات سے متجاوز ہوگی۔ غلام حسین ساجد کی غزلوں میں ریزہ کارانہ فکر کا خاصا عمل دخل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کی بوقلمونی پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ انسان پر چوطرف سے حملہ آور زندگی کے روبرو آ کر اس کے خلاف ردِ عمل کا اظہار کرنا شاعرانہ احتجاج، افسوس، درد اور نوحہ گری کے زمرے میں شامل ہیں:

سَر پر کِسی غریب کے ناچار گر پڑے — ممکن ہے میرے صَبر کی دیوار گر پڑے
کیا خُوب سُرخ رُو ہُوئے ہم کارِ عشق میں — دو چار کام آ گئے، دو چار گر پڑے
اِس بار جب اَجل سے مِرا سامنا ہُوا — کشتی سے خواب، ہاتھ سے پتوار گر پڑے
رَوشن کوئی چَراغ نہیں نخلِ طُور پر — سجدے میں کِس کو دیکھ کے اشجار گر پڑے
کرتی ہے فرشِ خاک کو دیوارِ آئنہ — آنکھوں سے جب یہ دولتِ بیدار گر پڑے
اُس پار دیکھ کر مجھے اِک گُلبدن کے ساتھ — جتنے مِرے گُلاب تھے اِس پار گر پڑے
ساجدؔ اگر عزیز تھی اپنی اَنا اُنہیں — کیا سوچ کر گلی میں مِرے یار گر پڑے؟

غلام حسین ساجد ایک گنی شاعر ہیں، اُنہوں نے نئی حقیقتوں کا تجربہ کرنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ اُنہوں نے جن نئے خوابوں کو اپنے شعری آئینہ خانوں میں منعکس کیا ہے اس کے لیے مناسب استعاراتی و علامتی بیانیے بھی تشکیل دیئے ہیں۔ ایک اچھے شاعر کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے نئے تجربات کے اظہار کے لیے کلیشوں کی طرف رجوع نہ کرے۔ غلام حسین ساجد کی ایجاد آشنا سائیکی نے اپنے شعری مجموعوں کے لیے ان کے مواد کی مناسبت سے مختلف زبان اختیار کرنے کا جتن کیا۔

روایتی اُردو ادب میں روح دوستی اور جسم پرستی کے رویوں کی شناخت دہلویت اور لکھنویت کے ادبی رجحانات کے دائروں میں کی جاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جسم و روح کی ثنویت کی دائروں میں پورے آدمی کی تمثال سامنے نہیں آ سکتی۔ شاعر کی خود کلامیوں، مکالموں اور سماجی بیانیوں میں جسم کہاں سے شروع ہوتا ہے اور روح کدھر سے شامل ہو جاتی ہے تا حال اسے ناقابلِ شناخت عمل کے بطور دیکھنا ہی مناسب ہے۔ ممتاز پنجابی شاعروں نے جسم اور روح کی ثنویت کے معاملات کو استعاراتی یا علامتی کل میں ڈھال کر دیکھا ہے۔ ان کے نزدیک عشق جسمانی پہلو بھی رکھتا ہے اور روحانی پہلو بھی۔ تاہم فنا کی اٹل حقیقت کے پیشِ نظر اُنہوں نے جسمانی ملاپ سے زیادہ روحانی وصل کو اہمیت دی۔ ان کے ہاں محبوب کی سراپا نگاری میں کشادہ اظہاری کا احساس ہوتا

ہے۔ وہ اپنے صوفیانہ رجحانات کے باوصف عشق ومحبت کی جسمانی بنیادوں کو نظر انداز کرنے کے حق میں نہیں تھے:

بدن کے اپنے تقاضے ہیں، روح کے اپنے ورائے عشق ذرا سی ہوس ضروری ہے

اسی ہوس کے بارے میں مرزا غالب نے نشاطِ کار کی ترکیب وضع کی تھی اور اس میں فنا و بقا کے معاملات کو منعکس پایا تھا۔

جدید اُردو شاعری میں افلاطونی عشق کے خلاف شدید ردِعمل اس لیے نظر آتا ہے کہ روایتی شاعری میں عشق کے آداب میں محبوب سے جسمانی دوری کو اہم جانا گیا تھا۔ عمومی طور پر جسم پرستانہ عشق سے کنارہ کشی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ن۔م۔ راشد اور میراجی نے اس رویے کے خلاف ردِعمل کا اظہار کیا۔ فراق گورکھپوری نے ''روپ'' کی رباعیوں میں جسمانی اظہار کے متنوع تیور قلمبند کیے۔ کئی دوسرے شاعروں نے بھی وصل کے کھلے قصوں کو اپنی نظموں اور غزلوں میں جگہ دی۔ غلام حسین ساجد نے اپنے شعری مجموعے ''تجاوز'' کی غزلوں میں روح اور جسم کی ثنویت کے تصور کو اہمیت نہیں دی۔ اُنھوں نے جا بجا خوش رنگ صحبتوں پر توجہ دیتے ہوئے جسم کی خوشبو کا ادراک کیا ہے۔ اس مجموعے کی ہر غزل میں بدنی عشق کا کوئی نہ کوئی پہلو دمکتا نظر آتا ہے۔ محبوب کی تابانی وجود کو وثن کر دیتی ہے۔ اس کی شریانوں کی سرگم کے سات سر اسے اپنی شہنائی بجانے پر آمادہ کرتے ہیں۔ تجاوز میں جس محبوب کا نقشہ سامنے آیا ہے وہ مجبورِ محض نہیں ہے۔ اس کی شخصیت میں ذہانت اور دانائی بھی شامل ہے۔ وہ اپنی شناخت میں عاشق کی مداخلت قبول نہیں کرتا۔ جا بجا اس کے وجود کی معنویت اپنے رنگ دکھا رہی ہے۔ محبوب کی قاف کی سی آنکھیں ن۔م راشد کو بہت کچھ کہہ جاتی تھیں۔ اس کے رسیلے ہونٹ جذبات خیز تھے۔ غلام حسین ساجد واجد علی شاہ کے پری خانوں میں جھانکنے کی بجائے اپنے پری خانے کو آباد رکھنے سے غرض رکھتے ہیں۔ وہ جس پری وش کے لیے شعر کہتے ہیں وہ ان کے اعصاب میں نوع بہ نوع کیفیات کو جنم دینے پر قادر ہے۔ وہ کبھی خوشبو کا احساس دلاتی ہے، کبھی اضطراب کا اور کبھی خواب کا۔ ان کیفیات کا تقاضہ تھا کہ شاعر کسی خوش نوا کے لیے نئے سر میں شعر کہتا۔ یعنی اس شعر شعاری میں راہِ سخن نکل رہی ہے۔ اس مجموعے کی ہر غزل میں شاعر نے نت نئی چاپیں سننے کے لیے اپنے دل کے دروازوں کو وا رکھا ہوا ہے۔

''تجاوز'' میں جس نوع کی بدن تجاوزیاں نظر آتی ہیں ان سے ہیولاک ایلس، فرائڈ، سلویا پلاتھ، ایریکا یونگ کے بعض متون کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ جدیدیت کا ایک فائدہ تو یہ ہوا ہے کہ قدیمیت کی ہوس لبادگی قدرے برہنہ آثاری کے ساتھ سامنے آ رہی ہے:

ہونٹ رکھ دیتا ہوں بالوں پر بلا تفریق میں زلف کیا ہے، کاکل پیچاں ہے کیا، گیسو ہے کیا

☆

ایک جادوئی بدن کی میزبانی کے لیے آئینہ خانہ بنوں یا آنکھ کا تارا بنوں

☆

آنکھوں سے ہونٹوں تک آنے میں کتنا کچھ بدل گیا پانی کی تاثیر الگ ہے مٹی کی تاثیر الگ





☆

سانسیں مہک مہک گئیں آنکھیں دمک دمک گئیں تیرے بدن کی آنچ سے دہکی ہوئی زمیں ہیں ہم

☆

اذن دیتی ہیں مجھے نیند سے بوجھل آنکھیں فال لیتا ہوں ابھی تک تری پیشانی سے

☆

اس کا یقین بڑھ رہا ہے میری ذات پر اب ہو رہا ہے بات بڑھانے سے فائدہ

☆

کچھ کمی سی رہ گئی تھی آج کار وصل میں آج وہ پہلی سی لذّت ہی نہیں محسوس کی

☆

اس پری وش نے کوئی اشارہ کیا اور نہ میں نے کوئی استخارہ کیا گفتگو میرے دل میں اُترتی گئی اور آخر مجھے وہ پسند آ گئی

☆

یہ کون خواب میں ساجدؔ مجھے دِکھائی دیا بلند نعرہ ہیہات کر رہا تھا میں

☆

کوئی گلاب تھا جسے ہم نے شگفت کر دیا کوئی لہو کہ لہر ہے جس میں سمو رہے ہیں ہم

غلام حسین ساجد کی غزلوں میں موجود الفاظ کے گونا گوں سلسلے ان کے تلازمہ کارانہ ہنر کی بدولت معانی کی متوقع اور غیر متوقع سطحوں کو سامنے لاتے ہیں۔ ایک شعر میں وہ کہتے ہیں کہ سلک تماثیل میں گلاب پروتے ہوئے وہ فردا کے مرغزاروں پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ شاعر عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ تب بنتا ہے جب وہ بقول غالب گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ زن ہوتا ہے۔ بہر حال غلام حسین ساجد کی ان غزلوں میں میں موجود بستر شکنیوں نے انہیں مشاہدہ حق کی گفتگو یعنی تصوف سے خاصا دور رکھا ہے۔ شاید اس لیے کہ صوفی نفس کشی اور تجرد گی پر زور دیتے ہیں اور غلام حسین ساجد نے اپنی مردانگی کے کھلے اعلانات سے اپنے پری خانے میں دھماکے کیے ہیں۔ ان غزلوں میں جسمانی بے تابیوں اور معاملہ بندیوں کے بہت سے نقوش سامنے آئے ہیں۔ لگتا ہے کوئی قوی، پر جوش فرد اپنی رگوں میں دوڑتے خون کی بدولت تمام احتیاطوں کو بالائے طاق رکھ کر انواع واقسام کے اعمال سرانجام دینے پر فرحاں وشاداں ہے۔ وہ اپنے روح کے خلا کو بھرنے کے لیے جسمانی مطالعات کو فوقیت دے رہے ہیں۔ ان کی یہ غزلیں اُردو شاعری کی معاملہ بند روایت کا احساس دلا رہی ہیں۔ میر حسن کی سحر البیان، میر اثر کی خواب وخیال، اور نواب مرزا شوق کی زہر عشق کے منظر تازہ ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ طلسمِ ہوشربا اور ریختی کے سلسلے مزید برآں ہیں۔ پنجابی میں ان کو وائف کو وارث شاہ نے سہتی کی زبانی کمال خوش اُسلوبی سے بیان کیا ہے۔ تاہم غلام حسین ساجد کی پروفیسرانہ اخلاقیات نے انہیں، اپنی مردانگی کا اظہار کرتے گلی محلوں میں موجود بگٹٹ کرداروں کی زبانوں سے ادا ہونے والی گفتگو سے قدرے پرہیز کرنے پر اُکسایا ہے۔

غلام حسین ساجد کی یہ غزلیں موضوعاتی اعتبار سے ریزہ کارانہ فنی بتنوں کی عکاس ہیں۔اس لیے ان کا نظماتی تسلسل میں جائزہ لینا ممکن نہیں ہے۔تاہم ان کے استعاراتی سانچے جہاں ایک طرف روایتی تاثر گری سے مملو ہیں وہاں ان کے وسیلے سے ان تمام سماجی مجبوریوں کی نشاندہی بھی ہوئی ہے کہ جن کی بدولت معاصر عہد کے نقوش سامنے آ سکے ہیں۔ان کے ایک شعر کا مفہوم ہے کہ سیمیا کے انوار ہر اس فرد کو بھی نظر آ سکتے ہیں جو بظاہر اپنے روز وشب سے بے خبر ہے۔سیمیا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ وہ علم ہے جو موہوم اشیا کو دکھا سکتا ہے۔یہ جسم در جسم انتقالِ ارواح کی شعبدہ بازیوں سے نسبتیں بھی رکھتا ہے۔سیمیائی اوہامی آئینہ گری، الوژن دامی، فریب بازی اور خیال بافی کے کرشمے دکھاتی ہے۔شاعری میں تخیل کے وسیلے سے نادرہ کار وہم سازی کی جا سکتی ہے۔اس میں خاک کو کیمیا بنانے یا کیمیا کو راکھ کرنے کے امکان موجود ہوتے ہیں۔غلام حسین ساجد وسیع المطالعہ شخص ہیں ان کا تخلیقی پیرا فرنیلیا کسی ایک مجموعے میں سمانے سے قاصر ہے۔انسان کا خمیر مٹی سے اُٹھایا گیا ہے اور مٹی کی رنگا رنگ تاثیروں سے کون واقف نہیں۔مٹی کے پتلے میں جب جان یا روح پیدا ہو جاتی ہے یا پھونکی جاتی ہے تو سو سو طرح کے کرشموں کے امکان روشن ہو جاتے ہیں:

دیکھ سکتا ہوں اندھیرے میں بھی اسی گل کو میں
جب تلک شمع بصارت مرے آئینے میں ہے

☆

کھل رہے تھے لذّت دیروز سے ساجد وہ لب
اپنے شرمیلے تجاوز کی دمک اوڑھے ہوئے

☆

نظر جھکائی تو آئینہ بے چراغ ہوا
زبان پھیر کے ہونٹوں پہ جگمگائے ہونٹ

غلام حسین ساجد کی غزلوں میں موضوعاتی بوقلمونی اس امر کی غماز ہے کہ اُنہوں نے اپنے مشاہدے، تحقیق، ذہانت، فراست، نکتہ سنجی، جوہر بینی اور تخیلی سیمیائی کی مدد سے الوانی معانی کے چراغ جلائے ہیں۔شاعر کی دسترس جب اپنے وجود پر ہو جائے تو وہ اپنے جوہر کی تہ رسی کر سکتا ہے۔اس کے لیے جس مگس کاری کی ضرورت ہوتی ہے غلام حسین ساجد کو اس کا مکمل احساس ہے۔مگس کا باغ میں جانا، شہد سازی کرنا، موم پیدا کرنا، چراغ بننا اور پھر پروانے کا جلنا۔یہ سب فنا و بقا کی کلیت کی نشاندہی کرنے والا عمل ہے۔یہ عمل طبیعیاتی بھی اور مابعد الطبیعیاتی بھی۔شاعر کا دماغ حقیقت سے ماورائیت اور پھر ماورائیت سے حقیقت کے درمیان پنڈولم کی طرح گرداں رہتا ہے۔وہ اپنی آواز سے اندھیروں میں موجود بتوں کے اندر جگمگاہٹیں پیدا کرنے کا ہنر رکھتا ہے۔یہ ہنر دوسروں کی جوہر شناسی پر بھی قدرت رکھتا ہے۔

(پروفیسر امریطس)
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور
(۵/مئی ۲۰۲۳ء)

◆◆◆



☆

جسم کی خوشبو الگ ہے، عِطر کی خُوشبو الگ
اور اس پر صُحبتِ خوش رنگ کا جادو الگ

وصل کی ساری خوشی کو چاٹ لیتی ہے یہ فکر
مَیں بچھڑ جاؤں نہ تجھ سے، ہو نہ جائے تُو الگ

میری وحشت نے کہیں کا بھی نہیں چھوڑا مجھے
شہر ہے بے زار مجھ سے، دشت میں آہو الگ

ختم ہونے میں نہیں آتی روایت ہجر کی
مَیں الگ دُکھ سہ رہا ہوں اور وہ مہ رُو الگ

ایک حیرانی لیے ہے، ایک طُغیانی لیے
آئنے کی خُو الگ ہے، آب جُو کی خُو الگ

ایک دریا کو رواں رکھنے کو آنکھیں ہار دیں
اور کنارے جوڑنے میں ہو گئے بازو الگ

صبح تھی ساجدؔ اُجالے سے حذر کرتی ہوئی
اور اُلجھتے جا رہے تھے رات کے گیسو الگ

☆

خواب کی دنیا الگ ہے، نیند کی دنیا الگ
کیا کوئی آئینہ گر ہے ان چراغوں کا الگ

کھینچ دی اظہارِ اُلفت نے تکلّف کی لکیر
اب مِرا ہونا الگ ہے اور ترا ہونا الگ

ساتھ رہنے کی تمنّا میں اکیلے رہ گئے
کر دیا بے صبر رہنے نے ہمیں کیسا الگ

کون اب آنکھیں مِلائے اُس گُلِ خورشید سے
نیند کا ماتا الگ ہے، جاگنے والا الگ

اُس کی تابانی نے روشن کر دیا میرا وجود
دھوپ میں ہوتا ہے جیسے جسم سے سایا الگ



غیر سے کوئی گِلہ کس واسطے ہو گا مجھے
کر دیا میرے ہی پیاروں نے مجھے تنہا، الگ

فِکر بھی رہتی تھی اُس کو، ذِکر بھی کرتا تھا وہ
کون کہتا ہے وہ میرے مسئلے سے تھا الگ

ایک جملے میں ہوئی ساجدؔ مِری تُرکی تمام
"مَیں کہاں تشریف رکھّوں؟" اُس نے فرمایا "الگ"

☆

مختلف میری بصیرت ہے نہ بینائی الگ
ہے وہی آئینہ خانہ، کارفرمائی الگ

اُس کے آنے سے مکمّل ہو گیا میرا وجود
ہو گئی میرے بدن سے میری تنہائی الگ

اس نگر میں عشق کرنے کی سزا معلوم ہے
بارِ غم سہنا پڑے گا اور رُسوائی الگ

لمس کی آشفتگی نے خود سے غافل کر دیا
جسم کی اینٹھن بڑھی اور نیند سی آئی الگ

جب قریب آئے تو قربت کی حقیقت کُھل گئی
فاصلہ بڑھنے لگا ہے، رنجِ پسپائی الگ



اُس کی شریانوں کی سرگم میں چُھپے تھے سات سُر
بج رہی تھی میرے سینے میں بھی شہنائی الگ

آج یکجا ہو گئی ہے لذّتِ فصلِ نشاط
اُس کے ہونے کی مسرّت، بادہ پیمائی الگ

ڈھونڈ کر لاؤں کہاں سے آپ کا نعم البدل
ایک تو وہبی ذہانت، اس پہ دانائی الگ

اب مجھے ساجدؔ میسّر ہیں جنابِ محتسب
اور نگراں میری وحشت پر ہے ہمسائی الگ

آبِ آئینہ الگ ہے، آنکھ کا پانی الگ
سادگی اپنی جگہ ہے، حشر سامانی الگ

لوگ آتے ہیں، ٹھہرتے ہیں مگر رُکتے نہیں
اُس کی دلداری الگ ہے، اُس کی مہمانی الگ

دیکھ سکتا تو نہیں، محسوس کر سکتا ہوں مَیں
کر رہا ہے اب کوئی میری نگہبانی الگ

ایک کی مسند زمیں ہے، ایک کی مسند فلک
فقر کی دنیا الگ ہے، کارِ سلطانی الگ

رنج سے بڑھ کر ہُوا کرتی ہے وحشت عشق کی
شامِ تنہائی الگ ہے اور ویرانی الگ

ایک حسرت ہے جو سینے میں سپر انداز ہے
اور گلی میں گھومتی ہے کوئی دیوانی الگ

عشق سے دوچار ہونے پر کُھلی ساجدؔ یہ رمز
اس کی دُشواری الگ ہے اور آسانی الگ

قیس کا قصہ الگ ہے، میرا افسانہ الگ
آئنہ خانہ الگ ہے اور پری خانہ الگ

مشترک ہوتا ہے دونوں میں زرِ دیوانگی
خُوئے عاشق سے مگر ہے خُوئے جانانہ الگ

روز ملتا ہے مجھے مجنوں کسی بازار میں
اور پیچھے پڑ گیا ہے ایک فرزانہ الگ

اُس کی آنکھیں چاٹ لیتی ہیں مِری آسودگی
اور کرتی ہیں مجھے، مجھ سے بھی بے گانہ الگ

اُس کے ہونٹوں کی بناوٹ نے مجھے بہکا دیا
کر دیا ہے چشمِ سرما سا نے مستانہ الگ

شام کو مِل بیٹھنے کا قرض ہے باقی ابھی
اور واجب ہے کسی دن اُس پہ ظہرانہ الگ

اب کھنچے رہتے ہیں میری ذات سے دیر و حرم
اور گریزاں ہے مِرے قدموں سے مے خانہ الگ

شعر کہتا ہوں مَیں ساجدؔ اِک پری وش کے لیے
اور سجاتا ہوں مَیں بزمِ ناز روزانہ الگ







☆

بستر لگا ہُوا، نئی چادر بچھی ہوئی
اُمّید، انتظار سے بڑھ کر بچھی ہوئی

محسوس کر رہا تھا اُسے انگلیوں سے مَیں
تھی دھوپ آئنے کے برابر بچھی ہوئی

ٹانکوں گا آج بامِ فلک پر وہ کہکشاں
پھر بھی دِکھائی دے گی سراسر بچھی ہوئی

اُس کے بغیر جیسے ادھوری تھی روشنی
اِک سبز دھوپ تھی سرِ منظر بچھی ہوئی

دیکھا اُسے تو اُس پہ تمہارا گماں ہُوا
تھی جھیل اِک پہاڑ سے چُھپ کر بچھی ہوئی

خوشبو تھی، اضطراب کی لو تھی کہ موجِ خواب
اب کیا بتاؤں کون تھی شب بھر بچھی ہوئی

مَیں پُرسکوں ہُوا تو اُسے بھی سکوں ملا
دیکھی ہے موجِ آب مکرّر بچھی ہوئی

ساجدؔ مِرے یقیں کی محافظ ہے آج بھی
اِک روشنی چراغ کے اندر بچھی ہوئی





☆

سُنائی دی ہے پلٹ کر مِری صدا مجھ کو
نئے سرے سے محبّت ہوئی ہے کیا مجھ کو

دکھائی دیتی ہے آنکھیں کبھی لب و رُخسار
مِلا نہیں ہے مگر خواب کا سِرا مجھ کو

گِلہ گزار نہیں جو مِرے تجاوز پر
گُریز کرنے پہ دیتا ہے کیوں دعا مجھ کو

کہاں کہاں کی مسافت نہیں رہی درپیش
پئے وصال عجب تجربہ ہُوا مجھ کو

خیال جیسے ہی آتا ہے سیرِ گل کا اُسے
پکارتی ہوئی آتی ہے پھر صبا مجھ کو

کسی چراغ کے ماتھے پہ اپنا نام لکھا
تو اپنے آپ پہ خود پیار آ گیا مجھ کو

دِکھائی دیتا ہے اب آئنے میں اپنا آپ
کسی سے عشق کی توفیق دے خدا مجھ کو

مَیں شعر کہتا ہوں ساجدؔ کسی نئے سُر میں
سُنے گا غور سے کیا کوئی خُوش نوا مجھ کو





☆

آئینہ دھوپ سے گُلِ اخگر بنا ہُوا
پہلو میں اِک چراغ مکرّر جلا ہُوا

تالاب بن گیا مِری آنکھوں کے سامنے
صحرا حدودِ شہر سے باہر پڑا ہُوا

پردے کی اوٹ میں ہے وہی بے کنار صبح
پیشِ نظر ہے شام کا منظر دُھلا ہُوا

سنتا ہوں کوئی چاپ کہیں دل کے آس پاس
کیا رہ گیا ہے اب بھی کوئی در کھلا ہُوا

ٹُوٹی جو میری نیند تو مَیں نے الگ کیا
دشنہ کتابِ خواب کے اوپر دھرا ہُوا

اُس کے قدم پڑے تو مِری آنکھ کُھل گئی
ہر چند تھا مَیں راہ کا پتّھر بنا ہُوا

''تُجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تُو''
کیا تُو ہے اس نواح میں افسر لگا ہُوا

ساجدؔ مَیں ہٹ گیا ہوں مگر میرے روبرو
کچھ تو ہے میرے قد کے برابر کھڑا ہُوا



☆

قریب لا کے اُسے، حرزِ جاں بنا کے اُسے
مگر رکھوں گا بھرے شہر سے بچا کے اُسے

بتا رہا تھا مجھے ٹُوٹتا بدن اُس کا
پسند آئے ہیں تیور مِری خطا کے اُسے

بڑھی ہے لذّتِ آسودگی تو دھیان آیا
کہ نیند ٹوٹ گئی ہو نہ، کسمسا کے اُسے

ہزار رنگ ہیں اُس کے، ہزار ڈھنگ اُس کے
ذرا سا دیکھ تو لوں کیا مَیں بھی گُنگنا کے اُسے

مِرا خمیر اُٹھایا گیا ہے مٹّی سے
بتائے بھید کوئی میری کیمیا کے اُسے

وہ جس کو سوچتے رہنا بھی لُطف دیتا ہے
مَیں دُور کیسے کروں گا قریب لا کے اُسے

نہیں ہے اُس کو شب و روز کی خبر لیکن
دکھائی دیتے ہیں انوار سیمیا کے اُسے

اور اُس سے پہلے کہ ساجؔد مجھے خبر ہوتی
عجیب لہر تھی جو لے گئی بہا کے اُسے



☆

بدن کی سیر نہ گردن کا مَس ضروری ہے
مگر وجود پہ کچھ دسترس ضروری ہے

یہ آئنہ ہے تو کیوں عکس سے گریزاں ہے
یہ باغ ہے تو یہاں خار و خس ضروری ہے

جو ہو سکے تو میاں نثر پر توجّہ دو
اگرچہ شاعری بھی اس برس ضروری ہے

بدن کے اپنے تقاضے ہیں، روح کے اپنے
ورائے عشق ذرا سی ہوس ضروری ہے

کہیں قیام کی خواہش نہیں کریں گے ہم
سفر ضروری ہے صاحب تو بس ضروری ہے

نہیں ہے کوئی تکلّف قریب آنے میں
دمِ وصال مگر پیش و پس ضروری ہے

ہر ایک راستہ آسان ہوتا جاتا ہے
مسافرت میں صدائے جرس ضروری ہے

یہ راز پایا ہے ساجدؔ بڑی تگ و دو سے
کہ آدمی کی بقا کو مگس ضروری ہے



☆

کوئی کر سکتا ہے تفریق کہاں ہم تم میں
ڈوب جاتے ہیں یہاں کون و مکاں ہم تم میں

جب کبھی ہوش میں آتے ہیں تو جانے کیسے
پھیل جاتا ہے تکلّف کا دُھواں ہم تم میں

تیری آنکھوں میں سما جاتی ہیں میری آنکھیں
بے اثر ہوتا ہے جب زورِ بیاں ہم تم میں

جب کسی لہر میں ہم پاس چلے آتے ہیں
پھیل جاتی ہے کوئی کاہکشاں ہم تم میں

اپنی دنیا کو مکمّل نہیں کر پائیں گے
جب تلک باقی ہے احساسِ زیاں ہم تم میں

کچھ بتانے کی ضرورت ہے نہ کچھ کہنے کی
اپنے اندر کی ہر اِک شے ہے عیاں ہم تم میں

راہ کر پائے گی دُنیا نہ ہمارے دل میں
بارور ہو گی نہ یہ فصلِ زیاں ہم تم میں

ڈھال بن جائیں گے ساجدؔ کسی دُشواری میں
مُنہ چُھپائیں گے کہاں وہم و گماں ہم تم میں



☆

جب سے وہ چاندسی صورت مِرے آئینے میں ہے
سر چُھپائے ہوئے حیرت مِرے آئینے میں ہے

رات بھر جس کا اُجالا تھا مِرے بستر پر
اب وہی سبز صباحت مِرے آئینے میں ہے

کوئی نشّہ ہے کہ آنکھوں سے چھلک جاتا ہے
کوئی مخمور حرارت مِرے آئینے میں ہے

دیکھ سکتا ہوں اندھیرے میں بھی اُس گل کو مَیں
جب تلک شمعِ بصارت مِرے آئینے میں ہے

دیکھتا رہتا ہوں کس کو، مجھے معلوم نہیں
اِک عجب طرح کی لذّت مِرے آئینے میں ہے

ٹِکٹکی باندھ کے تکتا ہے مِری صورت بھی
اُس پری وش کی عنایت مِرے آئینے میں ہے

معجزہ ہے کسی دل دار کا دل لے لینا
یہی خوش بخت کرامت مِرے آئینے میں ہے

اِک ستم گر نے کِیا ہے مجھے ساجدؔ مخمور
ایک بھرپور قیامت مِرے آئینے میں ہے



☆

نظر بہکنے لگی، جسم تھرتھرانے لگا
یہ کون میری صداقت کو آزمانے لگا

یہ کس کے واسطے وا ہو رہا ہے دروازہ
یہ کس خیال میں آئینہ مسکرانے لگا

وہ آ گیا تو مِری نیند نے کنارہ کیا
اور اسی عمل سے مِرا خواب بھی ٹھکانے لگا

ذرا سی دیر میں حِدّت کا زور ٹوٹ گیا
مِرے حصار میں آیا تو کپکپانے لگا

ابھی تو ٹھیک طرح سے اُسے چُھوا بھی نہ تھا
وہ ضبط کرنے کی کوشش میں کھلکھلانے لگا

مِرے طلسم نے پُرنور کر دیا اُس کو
وہ میری آنکھ سے ٹوٹا تو جھلملانے لگا

جو ہو سکے تو ابھی ہاتھ چوم لے اُس کے
اور اپنے سینے سے اُس کو کسی بہانے لگا

کچھ اِس قدر مِرا گرویدہ ہو گیا ساجدؔ
وہ اپنے گھر کو پلٹنا بھی بھول جانے لگا





☆

جبیں سے ہوتے ہوئے نقشِ پا تک آیا ہوں
یہ اور بات کہ مَیں دھوپ ہوں نہ سایا ہوں

خدا کرے کہ حقیقت کا سامنا کر پائے
اسے مَیں خواب سے باہر تو کھینچ لایا ہوں

تجھے تلاش کروں تو کہاں تلاش کروں
مَیں اپنے آپ کو مشکل سے ڈھونڈ پایا ہوں

کسی کی یاد کا سورج طلوع ہونے لگا
تو ایک بار اکیلے میں گنگنایا ہوں

لکھا ہُوا ہے مِرا نام جس کے ماتھے پر
مَیں گہری نیند میں اُس گُل کو چُوم آیا ہوں

بہت اُتار چڑھاؤ ہے اس تعلّق میں
کبھی مَیں جان سے پیارا، کبھی پرایا ہوں

چراغ جلنے لگے، آئنے دمک اُٹھّے
تو آج مَیں بھی ذرا کُھل کے مسکرایا ہوں

جھجکتا رہتا ہوں اذنِ کلام لیتے ہوئے
کہ جیسے مَیں کسی محفل میں بِن بُلایا ہوں

مَیں جاگ اُٹھّا ہوں ساجؔد بطرزِ نخلِ حیات
اور اِک عجیب سی مستی میں تھرتھرایا ہوں





☆

بدن کا لوچ، رفاقت کا حُسن کیا کہنے!
اور اِس پہ طرزِ عنایت کا حُسن کیا کہنے!

کوئی چراغ لپکتا ہُوا چلا آیا
زہے نصیب قیامت کا حُسن، کیا کہنے!

مِرے وجود، مِری ذات پر بھروسہ کیا
کسی کی نیک طبیعت کا حُسن کیا کہنے!

اسیر کرتا ہے لیکن بڑے سلیقے سے
جمالِ یار کی سیرت کا حُسن کیا کہنے!

اور ایسے وقت میں جب بات کرنا مشکل ہو
کبھی کبھی کی فراغت کا حُسن کیا کہنے!

ہر ایک روپ میں وہ بے مثال ہے لیکن
کسی انوکھی شرارت کا حُسن کیا کہنے

شعورِ ذات تو ساجؔد بہت ہے اُس گُل کو
اور اُس پہ وہبی بصیرت کا حُسن کیا کہنے!

☆

زُلف کی مہکار آنکھوں کی چمک اوڑھے ہوئے
بادلوں کے ساتھ اُڑتا ہوں دھنک اوڑھے ہوئے

اُس کو بھی اپنی محبّت پر نہیں ہے اعتماد
روز آتا ہے گلی میں کوئی شک اوڑھے ہوئے

ہُوک سی اُٹھتی ہے سینے میں کسی کے نام پر
آج قلبِ مضطرب ہے پھر کسک اوڑھے ہوئے

ایک ویرانے کو سر دیتے ہی عنقا ہو گئی
جُھنڈ مہتابی درختوں کا سڑک اوڑھے ہوئے

راہ دِکھلاتی ہے جب تک آئنے کی آب و تاب
چل رہا ہوں کوئی سایہ دُور تک اوڑھے ہوئے

کُھل رہے تھے لذّتِ دیروز سے ساجدؔ وہ لب
اپنے شرمیلے تجاوز کی دمک اوڑھے ہوئے



☆

بدن چُراتے ہوئے اُس نے جب چُرائے ہونٹ
کِھنچی کِھنچی رہیں آنکھیں تو مسکرائے ہونٹ

دِکھائی دیتے ہیں اور بے قرار کرتے ہیں
گھڑا گھڑایا وہ چہرہ، بنے بنائے ہونٹ

کِسی کے بوسۂ شیریں کے انتظار میں ہیں
جُھکی جُھکی ہوئی پلکیں، سجے سجائے ہونٹ

گُلال ہونے لگی آس پاس کی دنیا
ذرا سی دیر کو دانتوں میں کیا دبائے ہونٹ

نظر جھکائی تو آئینہ بے چراغ ہُوا
زبان پھیر کے ہونٹوں پہ جگمگائے ہونٹ

مجھے یقین نہ آتا تھا اپنی قسمت پر
چُھپا چُھپا کے مجھے اُس نے جب دِکھائے ہونٹ

اُکھاڑ ڈالے ہیں ساجدؔ کسی کی آہٹ نے
کسی کے نرم لبوں پر دھرے دھرائے ہونٹ

☆

خواب دیکھا ہی نہیں، نیند چُرائی ہی نہیں
جس کے آنے کی توقع تھی وہ آئی ہی نہیں

ایک آئینے کو دینا تھا مجھے اذنِ کلام
ایک تصویر بنانا تھی، بنائی ہی نہیں

لوٹ آیا ہوں کہ مَیں پار اُتر سکتا تھا
زحمتِ منزلِ مقصود اُٹھائی ہی نہیں

رازداں کوئی بنایا نہ زباں کھولی ہے
عشق میں عزتِ سادات گنوائی ہی نہیں

کس کو سینے سے لگاؤں، کہاں محتاط رہوں
دوست بھی دشمنِ جاں ہیں یہاں، بھائی ہی نہیں



اُس کی بانہیں بھی مِری سمت جُھکی رہتی ہیں
مہرباں مجھ پہ فقط دستِ حنائی ہی نہیں

کوئی خواہش تھی جسے اُس کے لیے ترک کیا
کوئی حسرت تھی جو سینے میں سمائی ہی نہیں

برف نے پاٹ دیا رات گئے میرا وجود
دھوپ سینکی ہی نہیں، آگ جلائی ہی نہیں

کوئی تقدیر سے شکوہ ہے نہ تدبیر سے لاگ
ناخدائی بھی غلط، کارِ خدائی ہی نہیں

اِس قدر خاک اُڑائی ہے گلی کوچوں میں
دشت بھی ہار گیا، آبلہ پائی ہی نہیں

بے دماغی کا یہ عالم ہے کہ ساجدؔ صاحب
یہ غزل جس کو سُنانا تھی، سُنائی ہی نہیں

☆

گریز کرتے ہوئے، اُس سے دُور ہوتے ہوئے
مَیں ایک خواب سے نکلا ہوں آج روتے ہوئے

کسی چراغ کدے سے کنارہ کرتا گیا
مَیں اپنے دل میں ستاروں کے بیج بوتے ہوئے

کبھی کبھی مجھے اپنا بھی دھیان آتا رہا
کسی کا درد کسی شعر میں سموتے ہوئے

کسی کی یاد مجھے پُرسکون کر دے گی
اگر مَیں تھک گیا بارِ گناہ ڈھوتے ہوئے

کبھی مَیں اپنے مقابل دکھائی دیتا ہوں
حساب لیتے ہوئے، تابِ صبر کھوتے ہوئے



مَیں گھر سے نیند میں چلتے ہوئے نکل آیا
اور اپنے آپ کو پایا گلی میں سوتے ہوئے

نگاہ کرتا ہوں فردا کے مرغزاروں پر
گلاب سِلکِ تماثیل میں پروتے ہوئے

عزیز تر ہے مجھے اب بھی وہ پری ساجدؔ
جو خوش دکھائی دی آنکھیں مِری بھگوتے ہوئے

☆

کسی کے بوسۂ شیریں کا دھیان آتے ہی
چپک گئی مِرے لب پر زبان آتے ہی

چراغ چھین لیے، آئنے بدل ڈالے
سَحر نے کھینچ لی مجھ پر کمان آتے ہی

یہ انتشار جو ہم رہ رووں نے خلق کیا
سمیٹ دے گا کوئی ساربان آتے ہی

مِرے ظہور کی صورت بنے تو کیسے بنے
کسی نے بھر دیے کون و مکان آتے ہی

مِرے عناد نے بے زار کر دیا ہے اُسے
کہاں ہُوا ہے کوئی بدگمان آتے ہی

عجیب شے ہے کسی شہر میں اُترنا بھی
بکھر گئے ہیں سبھی کاروان آتے ہی

مِرے حصار میں رہتی نہیں مِری آنکھیں
بُتانِ شیشہ گراں کی دکان آتے ہی



ہَوا بدلنے لگی، روز و شب بدلنے لگے
خلا کے بیچ کہیں خاک دان آتے ہی

نظر اُٹھاؤں تو وہ سامنے دکھائی دے
مِرے وجود میں تھوڑی سی جان آتے ہی

کوئی غرض نہیں اب اکل و شرب سے مجھ کو
اُلٹ نہ دوں کہیں نعمت کے خوان آتے ہی

کوئی چراغ مجرّد نہیں اُسے کہنا
جو ڈر گیا ہے بدن درمیان آتے ہی

نظر سے دل میں اُترنا بھی ایک فن ہے میاں
کہاں ہُوا ہے کوئی مہربان آتے ہی

ہمیشہ اپنے دکھوں کے اسیر رہتے ہیں
جو گھر کو چھوڑ نکلتے ہیں گیان آتے ہی

بکھرتا جاتا ہوں ساجدؔ اِسی توقّع پر
سمیٹ لے گا کوئی قدر دان آتے ہی

☆

بھرا نہیں ہے مِری روح کا خلا اب تک
کسی کا جسم تلاوت نہیں کِیا اب تک

مِرا ہُنر بھی مِرا ساتھ دے نہیں پایا
زباں پہ آیا نہیں حرفِ مدّعا اب تک

مَیں اپنے آپ سے اکثر سوال کرتا ہوں
وہ ہو چکا ہے مِرا یا نہیں ہُوا اب تک

مِرے گمان مِرے خواب کا محافظ ہے
مِرے یقین کا ضامن مِرا خدا اب تک

عجیب شور سا ہوتا ہے میرے سینے میں
پکارتی ہے مجھے کوئی کربلا اب تک

''وہ بات جس کا فسانے میں کوئی ذکر نہیں''
وہی تو کہہ نہیں پایا ہوں برملا اب تک

کبھی گلاب کبھی یاسمیں چھڑکتی ہے
مِرے بدن پہ کسی زلف کی ردا اب تک



تری دمکتی ہوئی چشم سرمہ سا کے سِوا
کلام کرتا نہیں کوئی آئنہ اب تک

کوئی تو شے ہے مِری کیمیا میں سب سے الگ
مِرے خیال کی نُدرت سے ماورا اب تک

زباں پہ آیا نہیں، آنکھ میں سمایا نہیں
ہے زیرِ لب کوئی دریائے بے بہا اب تک

وہ خوش خصال ہے اور درگزر کا عادی ہے
اگرچہ کی نہیں مَیں نے کوئی خطا اب تک

بہار سے کوئی نسبت ہے میری وحشت کو
کہ ہو رہا ہے وہی کارِ سیمیا اب تک

فضا میں گونجتی رہتی ہے میری خاموشی
سُنائی دیتی ہے سب کو مِری صدا اب تک

گُریز کرنے کی صورت نہیں رہی ساجدؔ
وہ اِس قدر مِرے نزدیک آ چکا اب تک

☆

رنج سے باخبر بھی ہو، غم بھی ہو کم سے کم اُسے
یعنی دیارِ عشق میں، رکھیں گے ہم قدم اُسے

آنکھوں کو بھر گیا ہے وہ، دل میں اُتر گیا ہے وہ
یعنی فقط گماں تھا یہ، بھولے ہوئے ہیں ہم اُسے

اُس کا خیال بھی کیا، اُس کا خیال بھی رہا
اور جو آس پاس تھا کر نہ سکے بہم اُسے

اِس کو بُلا لیا کبھی، اُس کو بُلا لیا کبھی
کیوں نہ پسند آئے گی صحبتِ جامِ جم اُسے

مَیں تو عجیب ہوں میاں، رہتا ہوں خود سے بدگماں
اپنے بھلے سے بے خبر کر دے نہ میرا غم اُسے



خاک سے جب نمو کرے، نُور سے جب وضو کرے
تو مَیں کسی طلسم سے کر دوں ہَوا میں ضم اُسے

امن کی بات اور ہے، جنگ کا فلسفہ الگ
جس کو امان مل گئی، رکھّوں گا محترم اُسے

آج کسی کی خامشی میرے لہو میں رچ گئی
اب مَیں نہیں دِکھاؤں گا اپنی کمر کا خم اُسے

☆

اُس کے قریب تو نہیں پھر بھی وہیں کہیں ہیں ہم
جاگے ہوئے نہیں اگر، سوئے ہوئے نہیں ہیں ہم

لاکھ جتن کیئے مگر ان کو نہیں منا سکے
آج یقین آ گیا، عرش ہے وہ، زمیں ہیں ہم

اپنی دمک چلی گئی، اپنی چمک کے ساتھ ہی
سایے میں اُس چراغ کے آ کے بہت حزیں ہیں ہم

ہم نے قفس میں رات دن صرف گنے ہیں سال و سن
خوابوں کے رازدان ہیں اور نہ پیش بیں ہیں ہم

اُس کی گلی میں آئے تو اُس کی گلی کے ہو گئے
اتنے برس کے بعد بھی اب بھی وہیں مکیں ہیں ہم

مشعلِ جاں بنے ہوئے، دل کی زباں بنے ہوئے
یعنی کسی وجود کی راحتِ اوّلیں ہیں ہم

ہم پہ کرم ہی کیجئے، ہم کو سزا نہ دیجئے
اُکھڑا ہُوا گمان ہیں، ٹُوٹا ہُوا یقیں ہیں ہم



☆

نقش بُجھے بُجھے ہوئے، عکس دُھلا دُھلا ہُوا
دیکھا ہے اُس کے قرب کا خواب مِلا جُلا ہُوا

میرے قریب آ سکے، مجھ سے مجھے چُرا سکے
اور عدو کو مل گیا میرا ہی گھر کُھلا ہُوا

رنج سے لاگ ہے اُسے، بزمِ طرب کے واسطے
صلح کی آرزو میں ہے جنگ پہ وہ تُلا ہُوا

جس کی ہنسی سے صبح دم ہوتی ہیں راحتیں بہم
باغ میں گھومتا ہے وہ رات گئے رُلا ہُوا

عشق نے شاد کر دیا اور لہو سے بھر دیا
قطرہ ہَوا کے لمس سے پھیلا تو بُلبلا ہُوا

صبح بکھر گئی تو کیا، رات گُزر گئی تو کیا
اب بھی ہے اُس کا منتظر سینے کا در کُھلا ہُوا

☆

دلبری کا رنگ کیا ہے، روپ کا جادو ہے کیا
یہ جو سانسوں میں اُتر جاتی ہے، یہ خوشبو ہے کیا

کیا ترے اُجلے بدن کے لمس سے آئینہ ہے
روشنی دینے لگا ہے جو، مِرا بازو ہے کیا

دو قدم چلتا ہوں سیدھا، دو قدم اُلٹی طرف
شہر میں وہ گل بدن ہے، دشت میں آہو ہے کیا

ایک ہی پَل میں مُعطّر ہو گیا سارا مکاں
خواب گہ میں آپ ہیں، دالان میں شبّو ہے کیا

آنے والا ہے کوئی اس خواب کے اندر ابھی
دل تو سینے سے لگا ہے ذہن بھی یکسو ہے کیا



شعر کہہ کر ٹانک دیتے ہو کسی دیوار پر
یہ سخن اس شہر کے ہر شخص پر لاگو ہے کیا

ہونٹ رکھ دیتا ہوں بالوں پر بِلا تفریق مَیں
زُلف کیا ہے، کاکلِ پیچاں ہے کیا، گیسو ہے کیا

نیند میں برپا ہوئی ساجدؔ کوئی بزمِ نشاط
میرے بستر کی پریشاں سلوٹوں میں تُو ہے کیا

آپ کے حُسن نظر کا والہ و شیدا بنوں
اب تلک جو بن نہیں پایا ہُوں، آئندہ بنوں

نیند میں چلنے کی عادت تو نہیں لیکن مِرے
جی میں آتا ہے کہ اُس کے خواب کا حصّہ بنوں

آپ کا ہونا الگ ہے، آپ سا ہونا الگ
آپ جیسا بن نہیں پایا تو اب کیسا بنوں؟

اس ہنسی کو جذب کرنے کے لیے کیا چاہیے؟
دل کو سازینہ بناؤں، گیت کا ٹکڑا بنوں

ایک جادوئی بدن کی میزبانی کے لیے
آئنہ خانہ بنوں یا آنکھ کا تارا بنوں

کارِ وحشت سے حذر کرنے کی عادت چھوڑ دوں
دشت کو نکلوں کسی دن اور دیوانہ بنوں

دھیان آتا ہے مجھے ساجدؔ تو ہنس دیتا ہوں مَیں
اُس پری وش کو چُرا لوں اور اُسی جیسا بنوں





حُسن کے گھایل الگ پڑے ہیں، باتوں کے نخچیر الگ
طوق گلے میں، ہاتھ بندھے ہیں، پاؤں میں ہے زنجیر الگ

آنکھوں سے ہونٹوں تک آنے میں کتنا کچھ بدل گیا
پانی کی تاثیر الگ ہے، مٹّی کی تاثیر الگ

دن بھر جس کی اوٹ میں رہ کر مَیں نے اپنا راج بچایا
رات گئے کیا میرے بدن سے ہو گی وہ شمشیر الگ

وہ آئے تو اس کے قدموں کی مٹّی بھی سینت کے رکھّیں
تنہائی تعظیم بھری ہو، محفل میں توقیر الگ

آ جائے تو اُسے ہمیشہ جلد نکلنا ہوتا ہے
اور اگر مِلنے جاؤں تو مِلنے میں تاخیر الگ

شہزادی! ناراض نہ ہونا میرے غلط رویّے پر
مَیں تو خود اپنا دشمن ہوں اور مِری تقدیر الگ

ساجدؔ صاحب کِس نگری کے رہنے والے ہیں کہ جہاں
کُھل کر سانس نہیں لے سکتے، رسمِ دار و گیر الگ

سوچیں تو آس پاس ہیں، دیکھیں یہیں کہیں ہیں ہم
بارے الگ الگ سہی، پھر بھی الگ نہیں ہیں ہم

سانسیں مہک مہک گئیں، آنکھیں دمک دمک گئیں
تیرے بدن کی آنچ سے دہکی ہوئی زمیں ہیں ہم

تیرے اسیر ہو چکے، تیرے سفیر بن چکے
اوروں کی کچھ خبر نہیں، تجھ سے بہت قریں ہیں ہم

روزِ ازل سے آج تک تیرے ہی منتظر رہے
اور ترے نصیب کی راحتِ اوّلیں ہیں ہم

لوگ نئے، زمیں نئی، لذّتِ انگبیں نئی
کوئی نیا دیار ہے، جانے کہاں مکیں ہیں ہم



جیسے ہمارے روبرو رکھے ہوئے ہیں آئنے
اپنے ہی مدح خواں ہیں ہم، اپنے ہی نکتہ چیں ہیں ہم

اچھّا ہے اپنی ذات میں کوئی کمی تو رہ گئی
سجدۂ شکر کے سِوا روٹھی ہوئی جبیں ہیں ہم

ہوتا ہے اپنے آپ پر گاہے وہ اب بھی مہرباں
کیوں کہ نہال ہیں کبھی اور کبھی حزیں ہیں ہم

☆

طلسمِ کُن سے مِرا سلسلہ وہی ہے ابھی
یہ عکس اور سہی، آئنہ وہی ہے ابھی

اسیرِ موجِ تغافل ہیں، کیا بتائیں ہم
نیا اضافہ ہے کیا اور کیا وہی ہے ابھی

بہت دنوں سے کسی خواب کے تعاقب میں
بھٹک رہا ہوں مگر فاصلہ وہی ہے ابھی

مَیں نامراد سہی، اپنی دُھن کا پکّا ہوں
وہ جانتا ہے، مِرا مدعا وہی ہے ابھی

جو میری ذات کا حصّہ ہے اور نہیں بھی ہے
مِرے گمان سے کچھ ماورا وہی ہے ابھی



قریب آتی ہے منزل نہ مَیں ٹھہرتا ہوں
دُعا وہی ہے ابھی، بد دُعا وہی ہے ابھی

وہی فرات، وہی تشنگی، وہی تعزیر
یزید اور سہی، کربلا وہی ہے ابھی

گُریز کرتے ہیں مرکز سے ہم مگر ساجدؔ
وہی محیط ہے اور دائرہ وہی ہے ابھی

☆

ہَوا میں اُڑتے ہوئے، پانیوں میں بہتے ہوئے
رواں دواں ہیں تری جستجو میں رہتے ہوئے

اِس آئنے میں تجھے دیکھ ہی نہ لے کوئی
مجھے یہ فکر بھی رہتی ہے شعر کہتے ہوئے

درخت بوجھ اُٹھاتے نہیں ہیں وحشت کا
اُکھڑ نہ جاؤ مِری بے کلی کو سہتے ہوئے

جہانِ خواب کو پُرنور کر دیا اُس نے
کنارے لگ گئے آخر چراغ بہتے ہوئے

ترے خیال سے مسرور بھی ہوں مَیں، لیکن
گرفتہ دل بھی ہوں بستر پہ روز ڈھہتے ہوئے!

ترے بغیر مجھے نیند ہی نہ آتی تھی
بہت اُداس ہوں اب تیرے پاس رہتے ہوئے

ہمیں جدا نہیں کر پائے گا کوئی ساجدؔ
اُسے تو خوف بھی آتا نہیں یہ کہتے ہوئے



☆

عشق آساں نہیں ہوتا ہے غزل خوانی سے
تم کوئی بات سمجھتے نہیں آسانی سے

عکس بنتا ہے نہ مَیں خود ہی دُھواں ہوتا ہوں
آئنہ دیکھ رہا ہے مجھے حیرانی سے

اِذن دیتی ہیں مجھے نیند سے بوجھل آنکھیں
فال لیتا ہوں ابھی تک تری پیشانی سے

میری تائید سے روشن ہے اگر بزمِ نشاط
کیا دمکتے ہیں ستارے مِری تابانی سے

میری دیوار گری، میری ہی دنیا اُجڑی
شہر کا جب بھی تصادم ہُوا طغیانی سے

اُس کے آنسو تھے کہ جلتے ہوئے انگّارے تھے
اُس نے پھر آگ لگائی ہے فقط پانی سے

آیئے اور کوئی دیر کو آرام کریں
ہم وہ حاتم ہیں جو تھکتے نہیں مہمانی سے

یوں ہی آ بیٹھے ہیں ساجدؔ ترے دروازے پر
فقر سے کوئی غرض اور نہ سُلطانی سے



☆

آوارگی کا بوجھ اُٹھانے سے فائدہ
آنے سے فائدہ کہیں جانے سے فائدہ

سپنے بکھر گئے، مِری آنکھیں چلی گئیں
اب نیند کا چراغ جلانے سے فائدہ

نخوت زدہ ہے اُس کی طبیعت تو پھر اُسے
مِلنے سے فائدہ نہ مِلانے سے فائدہ

اُس کا یقین بڑھ رہا ہے میری ذات پر
اب ہو رہا ہے بات بڑھانے سے فائدہ

مطلوب ہے تو داد رسی کیجئے حضور
کیا ہو سکے گا شور مچانے سے فائدہ

جب اُس کو میری ذات سے کوئی غرض نہیں
سُننے سے فائدہ نہ سُنانے سے فائدہ

بہتر یہی ہے ہم بھی تغافل سے کام لیں
جب کچھ نہیں ہے پیار جتانے سے فائدہ

ساجدؔ جواز چاہیے تائید کے لیے
اِس شب کدے میں آئنہ خانے سے فائدہ





☆

نظر جُھکائی ہوئی، آئنہ ہٹایا ہُوا
وہ شرمسار ہے یا خوب تِلملایا ہُوا

قریب لائی ہوئی کہکشائیں دُور ہوئیں
کسی نے پاٹ دیا راستہ بنایا ہُوا

یہ راہ کوچۂ دلدار کو نکلتی ہے
پلٹ نہ پائے گا پہلا قدم بڑھایا ہُوا

ذرا سی دیر کو نکلا تھا مَیں اندھیرے میں
تو میرے سر پہ مِری روشنی کا سایا ہُوا

سُنائی دیتی ہیں سرگوشیاں ستاروں کی
کسی نے عرش کو ہے فرش پر بچھایا ہُوا

کسی کی بزم میں بھُولے سے جا نکلتا ہوں
تو اپنے گھر کو پلٹتا ہوں طیش کھایا ہُوا

جواب دے نہیں پاتا ہوں اُس پری وش کو
مَیں ہر طرح کی کسوٹی پہ آزمایا ہُوا

پلٹ پلٹ کے اُبھرتی ہے اِک ہنسی ساجؔد
کہیں قریب ہی شاید ہے کوئی آیا ہُوا



☆

دِیا چراغ پہ، آئینہ خواب پر مامور
اور اِک ستارہ کہیں موجِ آب پر مامور

گلی میں آگ جلاؤں گا اور سینکوں گا
ازل سے مَیں ہوں زرِ پیچ و تاب پر مامور

ہَوا کا سامنا کرنا پڑے یا دنیا کا
نہیں ہوں مَیں کِسی گُل کی طناب پر مامور

مجھے گناہ سے نسبت نہ نیکیوں سے شغف
سو مَیں نہیں کِسی روزِ حساب پر مامور

شگفتہ ہوتی ہیں مجھ پر ابد کی تحریریں
کِیا گیا ہوں مَیں غیبی نصاب پر مامور

سوال اُٹھاتی ہے دنیا مِرے رویّے پر
کِسی کو کرتا ہوں مَیں بھی جواب پر مامور

مجھے تلاش ہے ساجؔد کِسی معلّم کی
جو ہو نقابتِ کارِ ثواب پر مامور

☆

آتشِ غم کی حرارت ہی نہیں محسوس کی
مَیں نے تو اُس کی عداوت ہی نہیں محسوس کی

ہاتھ مَلتے رہ گئے سب آئنے میری طرح
اُس نے مِلنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی

دمدمے پیٹے گئے، وحشی رجز گائے گئے
مَیں نے سِینے میں قیامت ہی نہیں محسوس کی

کچھ کمی سی رہ گئی تھی آج کارِ وصل میں
آج وہ پہلی سی لذّت ہی نہیں محسوس کی

اُس کے اقرارِ وفا پر کر لیا مَیں نے یقیں
اُس کے لہجے کی شرارت ہی نہیں محسوس کی



عشق نے محبوس کر رکھّا تھا میری عقل کو
رنج کی خوئے نہایت ہی نہیں محسوس کی

آپ سے بس اک شکایت ہے جو کہ دیتا ہوں مَیں
آپ نے میری محبت ہی نہیں محسوس کی

میری آنکھوں میں سمٹتی جا رہی تھی کائنات
مَیں نے آئینوں کی حیرت ہی نہیں محسوس کی

سب مِرے اپنے ہیں ساجدؔ سب مِرے دلدار ہیں
خلق سے مَیں نے کدورت ہی نہیں محسوس کی

☆

کہیں چراغ جلایا، کہیں بُجھایا گیا
کبھی اُٹھایا گیا ہوں کبھی بِٹھایا گیا

گُریز پا تھی مِری دھوپ سے مِری مٹّی
سو میری آگ سے اِک آئنہ بنایا گیا

مَیں نقشِ پا کی طرح خاک پر بچھا ہُوا ہُوں
کہ میرا عزم، مِرا خواب بھی چُرایا گیا

میاں! مَیں ہاتھ لگاتے ہی ٹُوٹ جاتا ہوں
مجھے سمیٹ نہ پائے گا کوئی آیا گیا

اگر یقین نہیں تھا کسی کے ہونے پر
تو کس گمان میں پہلا قدم بڑھایا گیا



بہت سے لوگ اُٹھے ہیں مِری حمایت میں
مِرے خلاف بھی ہر داؤ آزمایا گیا

مَیں کیا کروں گا! مجھے خود پتا نہیں ہے ابھی
اگر کسی کو تری بزم سے اُٹھایا گیا

ہر ایک چیز ہے ساجدؔ کہاں مِرے بس میں
اُسے بُھلانا تھا لیکن نہیں بُھلایا گیا

☆

کوئی پتّھر ہٹایا نہیں جا سکا، کوئی دیوار سر سے بلند آ گئی
اُس کی رم خوردگی کو دعا دیجئے، کیا ہُوا جو ذرا سی گزند آ گئی

کھو گئی رقص میں صبحِ آشفتگاں اور کُھلنے لگیں ابر کی چھتریاں
دوپہر بھیگ کر جھلملانے لگی، دن ڈھلے آسماں پہ کمند آ گئی

آئنے اپنی صورت بدلنے لگے، پھول اُڑنے لگے، پیڑ چلنے لگے
رنگ بہنے لگے، عکس ڈھلنے لگے، کیا اسے میری بستی پسند آ گئی

مِل گئی راہ چلتے کوئی سیم تن، آج پہنے ہوئے کاغذی پیرہن
جو مجھے خلوتوں میں بتائی گئی، اب وہ حسرت کتابوں میں بند آ گئی

کیا بتاؤں مَیں اس کے شب و روز کا، جھُوٹ کہیے اسے جو روایت کیا
کیا جُنوں تھا اسے صبح کی سیر کا، رات ہوتے ہی لے کے سمند آ گئی

اس پری وش نے کوئی اشارہ کیا اور نہ مَیں نے کوئی استخارہ کیا
گفتگو میرے دل میں اُترتی گئی اور آخر مجھے وہ پسند آ گئی



☆

مِری نظر میں بہت احترام ہے اُس کا
کہ دلبروں میں بہت نیک نام ہے اُس کا

بہت دنوں سے مقرّر ہوں مَیں کتابت پر
قلم تو میرا ہے لیکن کلام ہے اُس کا

طیور جیسے کسی خواب میں چمکتے ہیں
اسی نواح میں شاید قیام ہے اُس کا

نہیں ہے کوئی تعلّق اُسے فلسطیں سے
گُلِ دمشق ہے اور مُلکِ شام ہے اُس کا

یہ خاک اُس نے کسی نور سے الگ کی ہے
اور اس زمین پر اپنا نظام ہے اُس کا

اُسے مَیں قافلۂ نوبہار کہتا ہوں
سو کبکِ میرؔ سے بہتر خرام ہے اُس کا

یہ رنگ اُس کے ہیں یہ روشنی اُسی کی ہے
چراغ طاقِ ابد پر مدام ہے اُس کا

جو اُس کے پاس ہے وہ تو اُسی کا ہے ساجدؔ
جو میرے پاس ہے وہ بھی تمام ہے اُس کا







☆

کسی پری سے ملاقات کر رہا تھا مَیں
وہ اُڑ گئی تو ابھی بات کر رہا تھا مَیں

مجھی سے مانگ لیا مجھ کو اِک ستم گر نے
جو میرے پاس تھا خیرات کر رہا تھا مَیں

کسی نے توڑ دیا مجھ کو بے خیالی میں
ابھی تو ذات کا اثبات کر رہا تھا مَیں

مِری زمین کو جب بھی مِری ضرورت تھی
تو اس کے شہر میں برسات کر رہا تھا مَیں

خود اپنے گھر کا دِیا بھی مجھے بُجھانا پڑا
کہ ردِّ فخر و مباہات کر رہا تھا مَیں

مَیں دُھول جھونکتا رہتا تھا سب کی آنکھوں میں
اور اپنے آپ سے بھی ہاتھ کر رہا تھا مَیں

ابھی گمان ہُوا تھا کہیں حضوری کا
ابھی تلاوتِ آیات کر رہا تھا مَیں

یہ کون خواب میں ساجؔد مجھے دِکھائی دیا
بلند نعرۂ ہیہات کر رہا تھا مَیں





☆

گلی میں خاک اُڑی، آئنے پہ گرد پڑی
بدن میں جتنی حرارت تھی آج سرد پڑی

بُجھے چراغ تو گُل ہو گئے ہمارے خواب
تمہاری آنکھ سے ٹُوٹی تو نیند زرد پڑی

یہ کس کا نام لکھا ہے ہمارے ماتھے پر
یہ کس کے حکم سے بنیادِ شہرِ درد پڑی

مَیں روز دفترِ اعمال کو کھنگالتا ہوں
کہیں تو ہو گی مِرے روز و شب کی فرد پڑی

بہت ہی تیز تھی ساجؔد مِرے لہو کی آنچ
اُسے بُھلایا تو یہ نامراد سرد پڑی

☆

اپنی تلاش میں کہیں خود ہی کو کھو رہے ہیں ہم
نیند میں چل رہے ہیں ہم، خواب میں سو رہے ہیں ہم

لوحِ جہاں پہ دیر تک کوئی نہیں ٹھہر سکا
نقش بھی ہو رہے ہیں ہم، محو بھی ہو رہے ہیں ہم

رنج اُٹھا نہیں سکے، دھوپ سہی نہیں گئی
روزِ ازل سے آپ کے سایے میں جو رہے ہیں ہم

آج کسی کی یاد میں، حلقۂ ابر و باد میں
نِیر بہا رہے ہیں ہم، اشک پِرو رہے ہیں ہم

آج بہت قریب ہیں شمعِ سَحر طراز کے
رات کسی چراغ سے دُور بھی تو رہے ہیں ہم



اُس کا خرام ہو نہ ہو، چاہے قیام ہو نہ ہو
عرش اُٹھا رہے ہیں ہم، فرش کو دھو رہے ہیں ہم

کوئی گلاب تھا جسے ہم نے شگفت کر دیا
کوئی لہو کی لہر ہے، جس میں سمو رہے ہیں ہم

اُس کی خوشی کا پاس ہے، اُس کے کرم کی آس ہے
شور مچا رہے ہیں ہم اور نہ رو رہے ہیں ہم

ہاتھ بہت بے تاب تھے لیکن چنچل پوریں شرمائیں
پیشانی پر نام لکھا تو اُس کی آنکھیں بھر آئیں

اُس کے جلتے ماتھے کو جب مَیں نے اچانک چُوم لیا
اُس نے کتنے پیار سے میری ٹھنڈی ایڑیاں سہلائیں

دروازے سے بستر تک مَیں نیند میں چلتے آیا تھا
پھر مَیں اپنے ہوش میں کب تھا اور نہ میری پرچھائیں

سینے میں شہنائی بجنے کی آواز تو آئی تھی
لیکن ڈھول کہاں بجتا تھا آنکھیں دیکھ نہ پائیں

یوں لگتا ہے جیسے اُس کے اندر مَیں ہی رہتا ہوں
سو اُس سے جب بات ہوئی تو کیا کیا باتیں افشائیں

گھر میں ہوں اور گزرے دنوں کی یاد میں کھویا رہتا ہوں
جیسے وہ لینے آئے گا اور کہے گا ''آیئے سائیں''

آئینے کو آنکھیں بخشیں، مٹّی کو بینائی دی
اُس کے بعد کہیں جا کر وہ صورت مجھے دکھائی دی

اُڑتے اُڑتے آپہنچا ہوں شاید منزل کے نزدیک
کان اچانک جاگ اُٹھے اور اِک آواز سنائی دی

مَیں نے اِک دیوار لپیٹی اور بدن کو ڈھانپ لیا
جب دروازے سے باہر کی رہ نہ مجھے سُجھائی دی

چُپکے سے آیا اور آ کر اِک کونے میں بیٹھ گیا
میرے حق میں بات چلائی اور نہ مِری صفائی دی

اُس نے پوچھا ''ترکِ علائق کی صورت کیا ہوتی ہے؟''
مَیں نے جو تجویز بھی میرے اُلجھے ذہن میں آئی، دی

صورت، سیرت اُس نے بخشی، عقل و دانش اُس کی عطا
ساجدؔ اِک تقدیر بچی تھی وہ بھی بنی بنائی دی

☆

مان جائے گی اگر وہ جل پری رُوٹھی ہوئی
لوٹ آئے گی اچانک نیند بھی رُوٹھی ہوئی

جب تلک اُس کو نہیں آئے گا شاعر کا خیال
منتظر بیٹھی رہے گی شاعری رُوٹھی ہوئی

پاس آتی ہے عجب سنجیدگی اوڑھے ہوئے
مسکرا دیتی ہے چپکے سے کبھی رُوٹھی ہوئی

آ رہی ہے کس طرح سے اُس کے چہرے کی ضیا
جھلملاتی ہے کہاں یہ روشنی رُوٹھی ہوئی

سامنے اُجڑے ہوئے دربار کا دالان ہے
ایک کونے میں کہیں بارہ دری رُوٹھی ہوئی

دخل ہے اُس کی طبیعت میں تلوّن کو بہت
مہرباں مجھ پر ابھی ہے اور ابھی رُوٹھی ہوئی

ابتری کا راج ہے ساجدؔ مِرے چاروں طرف
بے کلی بپھری ہوئی، آسودگی رُوٹھی ہوئی



☆

بے گانگی کا قرض ادا ہی نہیں ہُوا
وہ عکس آئنے سے جُدا ہی نہیں ہُوا

وہ آ گئی تو اُس کی رفاقت میں خوش رہا
جیسے مَیں اُس پری سے خفا ہی نہیں ہُوا

اُس نے غلط کہا تھا کہ قربت محال ہے
لیکن کسی سے پاسِ وفا ہی نہیں ہُوا

غِیبت ہوئی نہ حرفِ شکایت زباں پہ لائے
کل رات ذکرِ کارِ جزا ہی نہیں ہُوا

کوئی غرض نہیں تھی مجھے اس گلاب سے
یہ اور بات تِیر خطا ہی نہیں ہُوا

کِھلتے ہیں پھول اور نہ آتا ہے برگ و بار
یہ وصف آسماں کو عطا ہی نہیں ہُوا

کس طرح بچ سکے گا کوئی سیلِ آب سے
جب اہتمامِ ردِّ بلا ہی نہیں ہُوا

ساجؔد وہی سیاہیٔ شب ہے مِرا نصیب
کیا میرا وقت صَرفِ دعا ہی نہیں ہُوا



☆

فصل بڑھنے لگی گُلِ نَے کی
اب ضرورت نہیں کسی شَے کی

رقص میں کون ہو گیا شامل
بے کلی بڑھ گئی رگ و پے کی

سانس لیتا نہیں ہوں اُس کے بغیر
اور ملاقات بھی نہیں طے کی

بارے اُردی کا کچھ بیاں ہو جائے
کچھ خبر مِل نہیں سکی دَے کی

بابِ عشتار کُھل رہا ہے کہیں
روشنی آ رہی ہے اب رَے کی

کان بجنے لگے ہیں جب سے مِرے
خامشی بڑھ گئی مِری لَے کی

پھر مجھے دیر ہو گئی ساجؔد
اب تو تقسیم ہو چکی مَے کی

☆

پانی کا رنگ طے ہَوا مٹّی کے رنگ سے
اِک زمزمہ شُگفت ہُوا موجِ سنگ سے

مَیں نے چراغِ خلق کیا اُس کی نیند سے
اُس نے خرام لے لیا میری ترنگ سے

ماتھے پہ اُس کے مُہر لگانے کی دیر تھی
ظاہر ہوئی شگفتہ دلی انگ انگ سے

دیکھا مجھے تو شرم سے خود میں سمٹ گئی
پَل میں کشادہ ہو گئے کپڑے وہ تنگ سے

خورشید جب لہو کے سمندر میں گر پڑا
بہنے لگا ہے نور کا دریا سرنگ سے



دیتا نہیں ہے درد کے موسم میں روشنی
نسبت ہے اس چراغ کو قلبی اُمنگ سے

جب سے گُریز پائی کا لپکا ہُوا اُسے
باز آ گیا ہوں مَیں کِسی بے سود جنگ سے

ساجدؔ کسی کی مدح میں سن کر تمہارے شعر
پھرتے ہیں میرؔ جی بھی ذرا دنگ دنگ سے

صاحبِ بزمِ طریقت ہے، کوئی راز ہے وہ
کوئی آراستہ میدانِ تگ و تاز ہے وہ

کام کرنے کا طریقہ اُسے آتا ہی نہیں
سچ بتاؤں تو نگاہِ غلط انداز ہے وہ

دل دھڑکنے کی صدا سُنتا ہوں اور سوچتا ہوں
رات دن کس کے لیے زمزمہ پرداز ہے وہ

اُس کے ہونے سے مِرا حوصلہ بڑھ جاتا ہے
اُس کا ہم راز ہوں مَیں اور مِرا ہم راز ہے وہ

سامنے اُس کے مِری بات نہیں بن سکتی
جس قدر سادہ ہوں مَیں اتنا ہی طنّاز ہے وہ



ماسوا اُس کے کسی اور کا مَیں کیوں ہوں گا
مِرا انجام ہے وہ اور مِرا آغاز ہے وہ

قیس آتا ہے مِری خیر خبر لینے کو
یعنی اس دشتِ جُنوں میں مِرا دم ساز ہے وہ

برملا کہتا ہوں مَیں آج یہ ساجدؔ صاحب
جس پہ اپنے سے زیادہ ہے مجھے ناز، ہے وہ

☆

مَیں نے اپنا غم نہیں بانٹا کسی ہم راز سے
میری محرومی ٹپکتی ہے مِری آواز سے

کون ہوں مَیں اور مِرے ہونے میں کس کا ہاتھ ہے
آج یہ قِصّہ سُناتا ہوں تمہیں آغاز سے

شعر کہتا ہوں حقائق کو چُھپانے کے لیے
لکھ رہا ہوں اِک کہانی بھی نئے انداز سے

لاکھ کوشش پر بھی میری بات بن پاتی نہیں
سامنا ہے آج کل میرا کسی طنّاز سے

عشق کیاہے، عشق کرنے کا سلیقہ ہے کسے
بات اس موضوع پر ہو گی کبھی دم ساز سے



چہچہے کرتے پرندے، کِھلکھلاتے بام و در
اُس نے زندہ کر دیا ہے شہر کس اعجاز سے

اپنے مخلص عاشقوں کی کچھ خبر رکھّا کریں
کام لیتے ہیں ابھی تک آپ کیوں اغماض سے

ایک دن ساجدؔ کریں گے اُس پری وش کو اسیر
اور اس دل کو نوازیں گے کسی اعزاز سے

☆

کلام کرنے کی حاجت نہیں نہ اب ہو گی
کبھی ہوئی بھی تو شاید بِلا سبب ہو گی

تجھے کسی سے علاقہ ہے اور نہ ہو گا کبھی
مجھے گماں ہے تو اگلے جنم میں رب ہو گی

ابھی اُداس ہیں اِک مہرباں کے کھونے پر
اور اس کے بعد یہاں محفلِ طرب ہو گی

طلوع ہو گی جو اِک خواب کے جھروکے سے
مجھے یقین ہے وہ نیند بھی غضب ہو گی

ابھی تلک تو محبّت نہیں ہوئی ہے مجھے
مجھے خبر بھی نہ ہو گی مگر یہ جب ہو گی

بچھڑتے وقت مِرے پاؤں چھُو لیے اُس نے
اب اِس سے بڑھ کے کوئی مہربان کب ہو گی

کسی کو آئے گی ساجدؔ جنابِ میرؔ کی یاد
اگر یہ گریہ و زاری تمام شب ہو گی



☆

ہُوا ہے طرزِ تغافل سے کیا کسے معلوم
چِٹخ گیا ہے کوئی آئنہ کسے معلوم

دُعا کو ہاتھ اُٹھانے کا حکم مانتے ہیں
قبول ہو گی نہ ہو گی دعا کسے معلوم

ہمیں وہ حاضر و ناظر دکھائی دیتا ہے
کہاں نہیں ہے، کہاں ہے خدا کسے معلوم

ابھی تو پہلا قدم ہے گُریز پائی کا
بڑھے گا اور ابھی فاصلہ کسے معلوم

کبھی کسی سے محبّت کریں گے آپ بھی کیا
تو اس نے میری طرح کہہ دیا ''کسے معلوم''

ابھی تو بوجھ ہے موجود کی رفاقت بھی
کہاں کِھلے گا گلِ سیمیا کسے معلوم

یہ باغ یوں ہی مہکتا رہے گا حشر تلک
ہمارے بعد کوئی آئے گا، کسے معلوم

سیاہ رات میں جو روشنی کا ضامن ہو
ہے کس چراغ میں یہ حوصلہ کسے معلوم

قریب آئیں گے اِک دوسرے کے بے کھٹکے
یہ کام ہو گا کبھی برملا کسے معلوم

زبان شعر میں ساجدؔ کسی کے دل کی بات
مَیں کہہ رہا ہوں مگر اِدعا کسے معلوم





☆

نیند سے باہر نکلوں گا اور خواب کے اندر دیکھوں گا
آج کسی دروازے پر مَیں دستک دے کر دیکھوں گا

کوئی منتر پھونکوں گا مَیں اپنے خالی بستر پر
یعنی خواب میں ایک پری کو آج مکرّر دیکھوں گا

اُس کی تابانی سے روشن ہو جائے گی ساری رات
اُس کے نور سے ایک دیے کو آج منوّر دیکھوں گا

جس کی عزت کرتا ہوں مَیں اپنی جان سے بھی بڑھ کر
مَیں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اُس کو کُھلے سر دیکھوں گا

ایک طرح کی دُوری پیدا کر لوں گا اس قربت میں
کبھی برابر حذر کروں گا، کبھی برابر دیکھوں گا

جس کو ساجدؔ میری ذات سے اب بھی وحشت ہوتی ہے
اس کے کھوج میں رہا کروں گا اور نہ اکثر دیکھوں گا

☆

وہ دُور چلا جائے گا سوچا ہی نہیں تھا
ہر چند مجھے خود پہ یقیں ہے نہ یقیں تھا

جب اُس نے مِری ذات کا اقرار کیا تھا
تب عرش کا خیمہ تھا نہ یہ فرشِ زمیں تھا

جاگی ہوئی آنکھوں کو بھی نسبت ہے اُسی سے
اور نیند کا خالق بھی وہی ماہِ مبیں تھا

بھر آئی مِری آنکھ تو وہ دیکھ نہ پایا
ناراض بہت مجھ سے کوئی شعلہ جبیں تھا

جس شے کا خیال آیا وہی عود کر آئی
درویش کا حجرہ تھا کہ فردوسِ بریں تھا



دل تھا کہ دھڑکتا چلا جاتا تھا مزے سے
یہ لُطف فقط کارِ محبّت کے تئیں تھا

ہیبت سے لرز اُٹھتے تھے پھر بھی در و دیوار
دربار لگا تھا نہ کوئی تخت نشیں تھا

محسوس یہ ہوتا تھا مجھے باغ میں ساجدؔ
خوشبو کے دروبست میں شاید وہ کہیں تھا

اُس پری کے مدار میں ہیں ہم
کچھ انوکھے خُمار میں ہیں ہم

آگ میں آپ کی شباہت ہے
اور لپکتے شرار میں ہیں ہم

محفلِ یار میں ہیں لب بستہ
اور صوتِ ہزار میں ہیں ہم

ابتدا کی خبر نہ آخر کی
کس قطار و شمار میں ہیں ہم

اپنی آنکھیں اُسی پہ نگراں ہیں
صبح کے کاروبار میں ہیں ہم



آپ کی بات کون ٹالے گا
آپ کے اختیار میں ہیں ہم

فاصلہ برقرار رہتا ہے
اپنے اپنے مدار میں ہیں ہم

اُس کو آنا ہے لوٹ کر ساجدؔ
منتظر اب بہار میں ہیں ہم

☆

ماتھے پر ہے مُہرِ غلامی، دل میں داغ اسیری کا
اور اُس پر آزار طلب ہے اب یہ عالم پیری کا

اب تو کوئی تُو بھی کہہ دے تو رونا آ جاتا ہے
اتنا رنج نہیں ہوتا تھا پہلے بے توقیری کا

آزادی سے بڑھ کر کوئی نعمت کیا ہو سکتی ہے
دل کو کیسے موڑ پر آ کر شوق ہُوا نخچیری کا

گہری نیند میں بجتے دیکھوں سرمستی کی سرگم کو
کوئی سُر شہنائی کا ہو کوئی راگ نفیری کا

آنکھ کُھلے تو اُس کو دیکھوں جس کے دونوں ہاتھوں میں
ایک کٹورہ پانی کا ہو، اِک پیالہ پنجیری کا

ساجدؔ ختم نہیں کر پایا مَیں اپنی بے راہ روی
اب تو مجھ پر داغ ہُوا ہے یہ ملبوس فقیری کا



☆

روشن کِیا ہے خواب نگر اُس چراغ نے
آساں کیا ہے سیر و سفر اُس چراغ نے

پڑھتے ہی سارے شہر کی آنکھیں چلی گئیں
کیا لکھ دیا تھا آئنے پر اُس چراغ نے

کھینچا مجھے تو کھینچ کے بانہوں میں لے لیا
دیکھا مجھے جو خاک بسر اُس چراغ نے

دیکھو اُسے جو دوسروں کو بھی دکھائی دے
ہم کو سکھایا ہے یہ ہُنر اُس چراغ نے

وہ بُجھ گیا تو روشنی سایے پہ جا گِری
منظر کِیا ہے زیر و زبر اس چراغ نے

لوٹا دیے ہیں وادیٔ نسیاں سے میرے خواب
یعنی نکال دی ہے کسر اُس چراغ نے

ساجدؔ اُسے بھی رنجِ دلی کا تھا سامنا
جب جب کیا ہے مجھ سے حذر اُس چراغ نے

آگ سے کھیلنے والوں میں کوئی مجھ سا کہاں
اب تجھے سوچنے والوں میں کوئی مجھ سا کہاں

جس سے مِلتا ہوں اُسے توڑ کے رکھ دیتا ہوں
بے کلی بانٹنے والوں میں کوئی مجھ سا کہاں

عشق ہوں اور بہت بپھرا ہُوا رہتا ہوں
توڑنے پھوڑنے والوں میں کوئی مجھ سا کہاں

مجھے پہچانتے ہیں اب تو گلی کوچے بھی
رات بھر جاگنے والوں میں کوئی مجھ سا کہاں

خود کو دیکھوں تو مجھے وہ بھی نظر آتا ہے
آئنہ دیکھنے والوں میں کوئی مجھ سا کہاں

میری شریانوں میں بہتی ہے محبّت ساجدؔ
ٹوٹ کر چاہنے والوں میں کوئی مجھ سا کہاں





کتابِ عشق مکمّل ہوئی، نہیں بھی ہوئی
کسی چراغ کے بل پر ہوئی، نہیں بھی ہوئی

کبھی وہ ابر کی صورت اگر برس بھی گیا
تو میری نیند معطّل ہوئی، نہیں بھی ہوئی

وہ میرے خواب میں آیا مِرے بُلاوے پر
یہ واردات مُسلسل ہوئی، نہیں بھی ہوئی

وہ صبح جس سے ہوئی میری جستجو آغاز
وہ میری آنکھ سے اوجھل ہوئی، نہیں بھی ہوئی

ذرا سی دیر کو آئی تھی جو ہمارے بیچ
وہ شاخ پھیل کے جنگل ہوئی، نہیں بھی ہوئی

کسی نے پیار سے جب پاؤں چھُو لیے میرے
زمیں وجود کی جل تھل ہوئی، نہیں بھی ہوئی

وہ میری روح پہ اِلقا ہوئی علائم میں
عجیب بات تھی مہمل ہوئی، نہیں بھی ہوئی

وہ رم کرے تو مِری روشنی بڑھے ساجدؔ
یہ سوچ کر بڑی ہلچل ہوئی، نہیں بھی ہوئی



☆

مجھ سے تعظیم چاہتا ہے میاں
میرا دشمن مِرا خدا ہے میاں

تو کسی اور کا نہ ہو پائے
یہ کدورت نہیں دعا ہے میاں

میری فرقت تباہ کن ہو گی
میری قُربت بھی اِک سزا ہے میاں

لاکھ چاہیں سِمٹ نہیں پاتا
کس قدر کم یہ فاصلہ ہے میاں

پاس آتے ہوئے جھجکتے ہو
یہ جُدائی کا مرحلہ ہے میاں

مَیں تجھے ہارنے سے ڈرتا ہوں
یہ محبّت نہیں تو کیا ہے میاں

تم پہ بوجھل نہیں یہ تنہائی
یہ تمہارا ہی حوصلہ ہے میاں

تمہیں آنا تھا! آ نہ پاؤ گے
یہ تو پہلے بھی ہو چکا ہے میاں

جانے والے پلٹ نہیں پاتے
یہ حقیقت تو آئنہ ہے میاں

پیاس لگتی نہیں کئی دن سے
میرا پیالا بھرا ہُوا ہے میاں

کیا یہیں ہم پڑاؤ ڈالیں گے
کیا یہی دشتِ نینوا ہے میاں

لکھتا پڑھتا ہے، شعر کہتا ہے
وہ بُرا ہے، بہت بُرا ہے میاں



مَیں نے انسان پر بھروسہ کیا
مانتا ہوں مِری خطا ہے میاں

اپنے ہونے پہ شرم آتی ہے
آگہی بھی بُری بَلا ہے میاں

راہبر کو ابھی کہاں معلوم
کارواں کب کا کھو گیا ہے میاں

شاعری کر رہا ہوں مَیں ساجدؔ
یہ مہارت نہیں عطا ہے میاں

☆

ہَوا چلنے لگی ہے، کم ہوئی آزردگی میری
ترے ہونے سے بڑھتی ہے شگفتہ خاطری میری

اکیلا تھا مگر یوں دام وحشت میں نہیں آیا
کہ میرے پاؤں کی زنجیر بنتی بے کسی میری

کہیں آتا ہے میرا ذِکر اِک دریا کے زُمرے میں
کہیں باتیں سُناتی ہے کبھی اِک جل پَری میری

کسی کو راس آتا ہوں، کسی پر بوجھ بنتا ہوں
عجب میری رفاقت ہے، عجب ہے دوستی میری

زباں پر مُہرِ خاموشی، بدن میں آتشِ سوزاں
ادھوری ہے ابھی میری طرح پیغمبری میری



نسیمِ صبح چلتی ہے نہ طائر گیت گاتے ہیں
جُدا ہے میرے ہونٹوں سے ابھی تک بانسری میری

خیال آتا ہے اس آسودگی کے بعد کیا ہو گا
اگر مَیں ہو گیا اس کا، اگر وہ ہو گئی میری

نکل جاؤں گا اُس کے سلسلے سے مَیں اگر ساجدؔ
کئی دن تک اُسے محسوس تو ہو گی کمی میری

چراغ اُڑنے لگے، آئینے سنورنے لگے
اگر وہ رشکِ بہاراں سنگار کرنے لگے

کسی کے ٹھُٹھرے ہوئے ہاتھ مَیں نے چُوم لیے
تو پھول کِھلنے لگے، ٹوٹ کر بکھرنے لگے

سَحر کا روپ لیا جب مِرے اُجالے نے
ستارے اور کسی عرش پر اُترنے لگے

گلی میں رات گئے پھر کوئی دِکھائی دیا
دِیے جھجکنے لگے اور مکان ڈرنے لگے

زمین تنگ نہیں، آسمان تنگ نہیں
تو کیوں وہ پہلا قدم آدمی پہ دھرنے لگے

جمالِ یار نے پُر نور کر دیا شب کو
پرندے صبح کی پہلی اُڑان بھرنے لگے

کسی طلسم نے پتّھر بنا دیا ساجدؔ
حیات رُک سی گئی اور دن گزرنے لگے





کسے ہے شُبہ تمہارے حَسین ہونے میں
حَسین ہونے میں اور بہترین ہونے میں

یونہی سمائے نہیں ہم تمہاری آنکھوں میں
بہت سا وقت لیا ہے مہین ہونے میں

چراغ ہوتا تو کب کا بُجھا دیا جاتا
مِرا دوام ہے ماہِ مبین ہونے میں

بنا بنایا ہُوا ہوں، گھڑا گھڑایا ہُوا
مِرا کمال نہیں ہے فطین ہونے میں

بہت لُبھاتے ہیں افلاک بھی مجھے لیکن
مزہ ہی اور ہے فرشِ زمین ہونے میں

ذرا سا فرق ہے لیکن مجھے بتائے کون
دُعا میں اور دُعا میں یقین ہونے میں

عجیب بات ہے ساجدؔ، اُسے تکلّف ہے
سوادِ قریۂ دل کا مکین ہونے میں

☆

فشارِ ذات ہے اور جاگنا قیامت ہے
اگر یہ عشق نہیں ہے تو کیا مصیبت ہے

یہ اور بات مجھے آدمی سے وحشت ہے
یہ اور بات مجھے آپ سے محبّت ہے

ترے بغیر مِری روشنی ادھوری ہے
ترے مدار میں رہنا مِری ضرورت ہے

ہمیں یقین نہیں اپنی بے گناہی پر
ہمارے دامنِ دل میں فقط ندامت ہے

ہمارے واسطے اِک راستہ کُھلا رکھو
گلہ گزار نہیں ہیں نہ یہ شکایت ہے



ذرا سا کام ہے اِک دل رُبا کے کوچے میں
اور اس کے بعد مجھے صبح تک فراغت ہے

نہیں ہے کوئی ضرورت گُریز کرنے کی
چراغ پاس ہے اور آئنہ سلامت ہے

وہ میری ذات کا اثبات بھی کرے ساجدؔ
کسی کے قُرب کی کیا کوئی ایسی صورت ہے

☆

اُس پَری وش سے کبھی آنکھ مِلاتے ہی نہیں
شعر کہتے ہی نہیں، پھول اُگاتے ہی نہیں

اُن کو بھی میری طرح خوف ہے رُسوائی کا
دیکھ لیتے ہیں مگر ہاتھ ہلاتے ہی نہیں

دل میں ہوتی نہ اگر قدر تری نسبت کی
ہم ترے ہجر کے یوں ناز اُٹھاتے ہی نہیں

ایسا لگتا ہے کہ بازار میں آ بیٹھے ہیں
کاش ہم حالِ دلِ زار سُناتے ہی نہیں

کھوئے رہتے ہیں کسی اور ہی دنیا میں کہیں
رقص کرتے ہی نہیں، جھُومتے گاتے ہی نہیں



اُس کی ہر بات پہ گر صاد نہیں کر سکتے
یہی اچھّا تھا، اُسے راہ پہ لاتے ہی نہیں

دل کی بستی ہے کہ لوگوں سے بھری رہتی ہے
جن کو رُخصت کیا جاتا ہے وہ جاتے ہی نہیں

کون ہیں اور یہ کس دنیا کے باشندے ہیں
عشق کرتے ہی نہیں، نیند چُراتے ہی نہیں

صاف کہہ دیتے ہیں ساجؔد جو ہمیں کہنا ہو
جھُوٹ کہتے ہی نہیں، بات بناتے ہی نہیں

کہاں اب مُنہ چھپائے گا ادھورا پن ہمارا
کسی نے بھر دیا ہے خیر سے دامن ہمارا

ستارہ ٹوٹ کر جب آسماں کی اور لپکا
خیال آیا کسی بے درد کو فوراً ہمارا

کسی کی یاد سے مخمور ہیں آنکھیں ہماری
کسی کے عکس سے گلزار ہے درپن ہمارا

نگاہِ یار میں توقیر کے لائق تو ہوں گے
زرِ خالص بنا دے گی اگر گلخن ہمارا

کسی کے رنج کا کوئی مداوا کیسے کرتے
ہمارے کام آ پایا نہیں جب فن ہمارا



خیالِ خاطرِ احباب تو رکھتے ہیں ہم بھی
مہکتا ہے یہ کس کے واسطے گلشن ہمارا

بدلتی جا رہی ہے کیمیا ہر شے کی صاحب
لگے گا کیا تمہارے شہر میں اب من ہمارا

ابھی امکان ہے اُس کے پلٹ آنے کا ساجدؔ
بھرا رہتا ہے پھولوں سے جبھی آنگن ہمارا

ہے مِرے گمان میں کیا بسا کوئی خواب ڈھوتا ہُوا بدن
کہ مِرے قریب نہ آ سکا مِرے پاس سوتا ہُوا بدن

کسی آئنے کا اسیر ہے، کسی سلطنت کا سفیر ہے
کبھی زرد ہوتا ہوا لہو، کبھی سرد ہوتا ہُوا بدن

مَیں قصیدہ خواں ہُوں جمال کا، مَیں پیام بر ہُوں وصال کا
مجھے اپنی جاں سے عزیز ہے کوئی خواب بوتا ہُوا بدن

ہو مِرا اسیر وہ کیا خبر، ہو نمو پذیر وہ کیا خبر
مِری گفتگو کے طلسم سے کوئی خود کو کھوتا ہُوا بدن

کہیں اپنے آپ سے بے خبر، مَیں بھٹک رہا تھا اِدھر اُدھر
تو پناہ لینے کو مِل گیا مجھے ایک روتا ہُوا بدن

مِری روشنی سے عیاں نہ تھا، مِری بے کلی پہ گراں نہ تھا
کسی مہربان طلسم سے مِرے گھر سموتا ہُوا بدن





تری سپنوں بھری صورت، تری بے خواب آنکھیں
مِرے دل کا اثاثہ ہیں وہ زیرِ آب آنکھیں

مِری نیندوں کا ورثہ ہیں مِرے خوابوں کی رونق
وہی اُلجھی ہوئی زلفیں وہی بے تاب آنکھیں

لبِ لعلیں کے بالیں پر مقرّر کی ہیں اُس نے
کبھی وہ سُرمگیں پلکیں، کبھی سیماب آنکھیں

کبھی زنجیر کر لیتا ہے کوئی آئنے کو
لپٹ جاتی ہیں آنکھوں سے کبھی گرداب آنکھیں

کوئی بے مثل حصّہ ہیں کسی کی داستاں کا
کتابِ رسمِ اُلفت کا وہ پہلا باب آنکھیں

یہ کس کا نام پیشانی پہ لکھ رکھّا ہے تم نے
یہ کس کی چاہ میں رہتی ہیں یوں شاداب آنکھیں

مجھے ساجدؔ کوئی صورت پسند آتی نہیں ہے
مِری آنکھوں کا حصّہ ہیں تری نایاب آنکھیں

☆

وہ جب سے مہربان ہُوا اِس غلام پر
اُس دن کے بعد آیا نہیں کوئی کام پر

اب باغ میں کسی کو مِری جستجو نہیں
کھلتے تھے کتنے پھول کبھی میرے نام پر

اُس کے قریب ہونے کی کوشش کے باوجود
اب تک کھڑے ہیں ایک مقرّر مقام پر

شیریں سخن نہیں ہے کوئی ویسا شہر میں
قربان کیوں نہ جایئے حُسنِ کلام پر

کیا چاند دیکھنے کی ضرورت نہیں رہی
کتنے دنوں سے وہ نہیں آیا ہے بام پر



کہتا ہے کوئی اب بھی مجھے روز خواب میں
یلغار کیجئے گا کبھی ملکِ شام پر

کیوں روز بار بار اُلجھتی ہے داستان
شاید کبھی یہ بھید کُھلے اختتام پر

دمکا ہے واٹس ایپ پر اِک قلبِ مضطرب
جانم ہزار شکریہ اس اہتمام پر

ساجدؔ نگار خانہ تو باقی نہیں رہا
خوش ہوں مگر مَیں آئنوں کے انضمام پر

☆

ماتھے پہ نام ثبت ہے، آنکھوں میں کچھ خمار سا
آیا ہے اِک حَسین پر آج سبھی کو پیار سا

کام کا آدمی ہوں مَیں، عام سا آدمی ہوں مَیں
کون فرشتہ ہے یہاں، کون یہاں ہے پارسا

پہلے تو رنگ اُڑ گیا خواب میں دیکھ کر اُسے
بعد میں آ گیا مگر چہرے پہ کچھ نکھار سا

خاک میں مِل گیا ہوں مَیں، پھول سا کِھل گیا ہوں مَیں
اُڑتا ہے کوئے یار میں اب بھی مِرا غبار سا

آنکھیں مُندی مُندی ہوئیں، باتیں ذرا گندھی ہوئیں
نقش ہے میرے ذہن پر موسمِ نو بہار سا



ایک عجیب لہر میں، خوار ہوئے ہیں شہر میں
مَیں بھی ہوں شرمسار سا، وہ بھی ہے شرمسار سا

صبح ہوئی تو دھوپ کی چھاؤں میں سو گیا کہیں
مہکا ہُوا تھا خواب میں رات جو لالہ زار سا

آتا ہوں روز باغ میں ایک عجیب لہر میں
اور کسی کی یاد کا بہتا ہے آبشار سا

☆

اجنبی لگ رہا ہے ہر اِک راستہ تم سے مِل کر مجھے
ایک ہی رات میں جانے کیا ہو گیا تم سے مِل کر مجھے

تم اگر ساتھ ہو تو مجھے جاننے کی ضرورت نہیں
کیا مِلا ہے مجھے کیا نہیں مِل سکا تم سے مِل کر مجھے

کس قدر شاد ہوں اور آزاد ہوں خود کو پہچان کر
مِل گیا ہے مِری روح کا آئنہ تم سے مِل کر مجھے

تم نے پہچان دی ہے مِرے خواب کو، میرے اسباب کو
اپنے ہونے پہ ایمان آنے لگا تم سے مِل کر مجھے

کتنا آسان تھا خود کلامی کے پردے میں اظہارِ دل
آج مشکل لگا ہے وہی مرحلہ تم سے مِل کر مجھے

کِھل رہا ہے کہیں اِک گلِ سیمیا برسرِ نینوا
لگ رہا ہے رَوا بھی مگر ناروا تم سے مِل کر مجھے

شہر بھی ہے وہی، لہر بھی ہے وہی، بحر بھی ہے وہی
کیوں نئی لگ رہی ہے یہ آب و ہَوا تم سے مِل کر مجھے



☆

جہاں تم پائے جاتے ہو وہیں ہوتا ہوں مَیں بھی
اسی بازار میں شاید کہیں ہوتا ہوں مَیں بھی

مَیں اُس کا عکس ہوں اور آئنے کی قید میں ہوں
وہ جب ظاہر نہیں ہوتا، نہیں ہوتا ہوں مَیں بھی

دھڑکتا ہے مِرا دل بھی کسی گُل رُو کی خاطر
کسی کے واسطے فرشِ زمیں ہوتا ہوں مَیں بھی

کوئی وحشت لیے پھرتی ہے اپنے ساتھ مجھ کو
کبھی صحرا کبھی گھر کا مکیں ہوتا ہوں مَیں بھی

مَیں اپنا رنج ظاہر کر نہیں سکتا کسی پر
پریشاں تو بہت اے ہم نشیں ہوتا ہوں مَیں بھی

مَیں اپنے آپ پر اب بوجھ بنتا جا رہا ہوں
کسی دن اب کسی بُت کے قریں ہوتا ہوں مَیں بھی

مَیں نجمِ خواب ہوں اور روشنی میں بُجھ رہا ہوں
اندھیرے میں چراغوں سا حسیں ہوتا ہوں مَیں بھی

غرض اپنوں سے کوئی ہے نہ اب غیروں سے مجھ کو
مگر اپنے کیے پر نکتہ چیں ہوتا ہوں مَیں بھی

مقرّر فاصلے پر وہ مجھے رکھتی ہے ساجدؔ
قریب اُس کے بہت اپنے تئیں ہوتا ہوں مَیں بھی



☆

آئنے میں عکسِ حیرت کو سمانا ہی نہیں
منتظر اُس کا ہوں جس کو آج آنا ہی نہیں

نام کرنی ہے کسی کے بے کراں آسودگی
صرف اُس کے گھر کی دُنیا کو بچانا ہی نہیں

کس لیے تصویر کرتا جا رہا ہوں وقت کو
حالِ دل اُس کو اگر مَیں نے سُنانا ہی نہیں

ایک نادیدہ عدو کا خوف سب کے دل میں ہے
شہر بھی مشکل میں ہے، میرا گھرانا ہی نہیں

اُس نے سینے سے لگایا تو یقیں آیا مجھے
میری قسمت میں فقط دل کا لگانا ہی نہیں

کوئی اُس جیسا کہاں ہو گا بساطِ دہر پر
اُس کا غصّہ بھی الگ ہے، مُسکرانا ہی نہیں

اُس کی آنکھوں کی چمک نے کر دیا ظاہر یہ راز
مَیں سمجھتا تھا ابھی میرا زمانہ ہی نہیں

کوئی مشکل کس لیے آئے گی میری راہ میں
راہ پر مَیں نے جب اُس خوش رُو کو لانا ہی نہیں

جان سے پیارے ہیں ساجؔد یہ گلی کوچے مجھے
اس نگر میں میرا گھر ہے، آب و دانہ ہی نہیں





☆

ہم تو بے خود ہیں ایک ہی کش میں
کتنی گرمی ہے دُودِ آتش میں

فرق کیا ہے مجھے نہیں معلوم
واہ کہنے میں اور عَش عَش میں

نیند کی ڈور کھینچنے والا
خواب کوئی نہیں ہے ترکش میں

کاش یہ معجزہ بھی ہو سکتا
مِل بھی جاتا کہیں وہ اس رش میں

اپنے موجود سے ہوئے غافل
اُس کو پانے کی اس کشاکش میں

روح کا بھید کس طرح کُھلتا
کھو گیا تھا مَیں اُس کی لش پش میں

مَیں تو گھر میں اسیر ہوں ساجؔد
اور مِری جان اِک پری وش میں

☆

اُس پری زاد کا کنایہ کیا
کیجئے اب کوئی اشارہ کیا

آئنہ دیکھ کر جسے چُپ ہے
تم نے دیکھا ہے وہ سراپا کیا

کوئی زنجیر سی کھنکتی ہے
مَیں گرفتار ہوں کسی کا کیا

پاؤں دَھرتا ہوں پھر اندھیرے میں
کچھ نہیں جانتا کہ ہو گا کیا

جانتا ہوں کہ بے وفا ہو تم
آزمائے کو آزمانا کیا



اب تو خود پر بھی اعتبار نہیں
اب کسی اور کا بھروسا کیا

دفعتاً آنکھ کُھل گئی میری
تم نے پھر نیند میں پکارا کیا

دین و دنیا کے ہم رہے ہی نہیں
اب ہے اس شوخ کا ارادہ کیا

کس قدر مہرباں ہے وہ مجھ پر
اُس نے مجھ بے نَوا میں دیکھا کیا

کتنے نزدیک آ چکے ہیں ہم
تم نے اس مرحلے پہ سوچا کیا

صاحبِ اختیار تو ہے وہی
ہم تو مجبور ہیں، ہمارا کیا

مَیں نے سوچا نہیں کبھی ساجدؔ
آپ کا کیا ہے اور میرا کیا

☆

سَحر ہوتے ہی دُنیا کے رگ و پے میں اُتر آئی
ترے باطن کی خاموشی، تری آنکھوں کی گویائی

بہت مرغوب ہے مجھ کو تلوّن سو مجھے اُس کے
خوش آتے ہیں تجاوز آشنا آدابِ پسپائی

کہیں پر رات ہوتی ہے، کہیں سورج نکلتا ہے
کہیں تکرارِ گریہ ہے، کہیں بجتی ہے شہنائی

حجاب آتا ہے جس کو آئنے سے بھی اکیلے میں
اچانک سامنے پا کر مجھے وہ خوب شرمائی

قرار آئے گا کیسے آئنہ بردار آنکھوں کو
عطا ہو گی مجھے کیسے دماغ اور دل کی یکتائی

بدلتی جا رہی ہے یوں تو دُنیا کی روش لیکن
مقدّر ہے مِرے جیسوں کا اب بھی آبلہ پائی

بہار آئی تو آئیں گے مِرے حصّے میں بس ساجدؔ
پریشانی، خجالت، بے دماغی اور رُسوائی



☆

سر کھپاتا ہی نہیں نیند کی تیّاری میں
خواب آتے ہیں مجھے عالمِ بیداری میں

کیوں اُتر آئی ہے اُن پھول سی آنکھوں میں نمی
یہ تو دیکھا ہی نہیں وصل کی سرشاری میں

عشق اور عشقِ حقیقی میں کوئی فرق نہیں
یعنی نسبت ہے اسیری میں، گرفتاری میں

بعض اوقات پہنتی ہے وہ شلوار قمیض
اور کسی روز لُبھاتی ہے مجھے ساری میں

کون سمجھائے گا ان گریہ پرستوں کو یہ بات
فرق ہوتا ہے عزاداری میں اور زاری میں

اب بھی رہتا ہے اُسے چاہنے والوں کا خیال
اب بھی رکھتی ہے وہ ہر یاد کو الماری میں

اُس نے بھی مجھ سے نبھائی نہیں نسبت ساجدؔ
آج مشہور ہوں مَیں جس کی طرف داری میں

☆

موجِ وحشت نے عجب آگ لگائی ہوئی ہے
باغ میں کوئی دھنک رقص میں آئی ہوئی ہے

کچھ بھی اپنا نہیں اِس عالمِ فانی میں مِرا
خواب گہنایا ہُوا، نیند چُرائی ہوئی ہے

ٹانک رکھے ہیں ستارے کسی آئینے پر
ابر پھیلایا ہُوا، دھوپ بچھائی ہوئی ہے

اب نیا کچھ بھی نہیں ہم میں شراکت کے لیے
مَیں نے ہر تازہ غزل اُس کو سُنائی ہوئی ہے

گُھلتی جاتی ہے ہَوا میں ترے بالوں کی مہک
اور فضا آبِ تبسّم میں نہائی ہوئی ہے

کچھ بھی موجود نہیں اُس کی تواضع کے لیے
ایک کمرے میں فقط شمع جلائی ہوئی ہے

آنے والا ہے بہت کارِ محبّت کا مزہ
مَیں بھی شرمایا ہُوا، وہ بھی لجائی ہوئی ہے



☆

کام مشکل ہے مگر انکار بھی کر دیکھیے
کوئی دروازہ کبھی دیوار بھی کر دیکھیے

اپنے دشمن کی رفاقت پر مقرّر کیجیے
آئنے کو در پئے آزار بھی کر دیکھیے

عشق کیا کوئی تماشا ہے کہ بس دیکھا کریں
ڈوب کر اک روز دریا پار بھی کر دیکھیے

ہاں! یہی دُنیا ہے اپنی ہم اِسی دنیا کے ہیں
خود غرض بَن جایئے، ایثار بھی کر دیکھیے

غیر سے نسبت رہی ہے، غیر کو سمجھا کیے
خود کو اپنے آپ سے دوچار بھی کر دیکھیے

بانٹ دیکھی ہیں اگر خوشیاں تو کچھ دن کے لیے
درد کی دولت کا کاروبار بھی کر دیکھیے

آج بھی ہے آفتاب آمد دلیلِ آفتاب
نیم وا آنکھوں سے یہ دیدار بھی کر دیکھیے

عشق میں ساجدؔ جو ہو سکتا ہے کرنا چاہیے
ضبط بھی کر دیکھیے، اظہار بھی کر دیکھیے



☆

ہونٹ ہونٹوں پہ، ہاتھ ہاتھوں میں
جل رہے تھے چراغ پھولوں میں

دھوپ تحلیل ہو کے پانی میں
منقسم ہو گئی ہے رنگوں میں

بڑھتی جاتی ہے لذّتِ گفتار
کون رس گھولتا ہے باتوں میں

کتنا بے صبر ہو رہا ہوں مَیں
لے نہ لوں اب کسی کو بانہوں میں

کوئی بتلائے گا کہ عاشق کو
نیند آتی ہے کتنے برسوں میں

صرف آئینہ دیکھ سکتا ہے
روشنی ہے کہاں چراغوں میں

دل میں جو شمع جگمگاتی تھی
آج ضم ہو گئی ستاروں میں

مَیں نے ساجؔد اُترتے دیکھے ہیں
رنگ رنگوں میں، گیت گیتوں میں





☆

پہلے تو آبِ نُور سے مَیں باوضو ہُوا
پھر خواب کے حضور میں آئینہ رُو ہُوا

اپنا کہا بھی کام ہمارے نہ آ سکا
جو لفظ لکھ دیا وہی طوقِ گلو ہُوا

دیکھوں تو گر پڑیں نہ ستارے زمین پر
سینچا ہے جس بھی پیڑ کو وہ بے نمو ہُوا

رکھّوں گا اس کو سینہ خراشی کے کام پر
وہ طوطیٔ جمال اگر خوش گلو ہُوا

مجھ میں کہاں تھا اُس کو لُبھانے کا حوصلہ
نخچیر اپنے شوق میں وہ خُوب رُو ہُوا

اِک سرخوشی بھی شاملِ رنگِ ملال ہے
مدّت کے بعد آپ ہی وہ چارہ جُو ہُوا

ساجؔد تجھے نمود کی خواہش نہیں تھی کیا
ناکام اپنا نام کمانے میں تُو ہُوا!

☆

کسی چراغ سے مَس ہو گیا بدن میرا
تو مجھ سے روٹھ گیا اضطرارِ فن میرا

اسی نواح میں موجود تھا کہیں مَیں بھی
مجھے خیال سا آیا ہے دفعتاً میرا

مَیں قافلے کے مقدّر سے لاتعلق ہوں
کہ راہبر ہی مِرا ہے، نہ راہ زن میرا

ہَوا کی طرح گزرتا ہوں اُس کے کوچے سے
سو منتظر ہے ابھی آہوئے ختن میرا

دمک رہا ہے مِرا عکس میری آنکھوں میں
کہ آئنہ ہے کسی خواب میں مگن میرا



مَیں ایک دیدۂ بے خواب کی نگاہ میں ہوں
کسی کے کام نہ آئے گا بھولپن میرا

کوئی ٹھکانہ نہیں ہے مِری فصاحت کا
مِرے کلام پہ ایزاد ہے سخن میرا

یہیں کہیں کوئی دیوار مَیں نے کھینچی تھی
یہیں کہیں کوئی دریا تھا موجزن میرا

مَیں اپنے آپ سے جب بدگمان ہوتا ہوں
تو میرا مان بڑھاتا ہے حُسنِ ظن میرا

کسی گلاب سے نسبت کا ذکر آتے ہی
خیال آئے گا اس شوخ کو معاً میرا

یہ کون مسندِ جمشید پر فروکش ہے
یہ کس گلی میں بھٹکتا ہے کوہ کن میرا

یونہی دمکتے رہیں میرے آئنے ساجدؔ
خدا کرے کہ مہکتا رہے چمن میرا

☆

نہ کوئی فرق پڑے گا کسی کو کھو کر بھی
کہ ہم قریب نہیں ہیں قریب ہو کر بھی

یہ دل کا بوجھ ہے ہنسنے سے کم نہیں ہو گا
اگرچہ دیکھ چکا تخلیے میں رو کر بھی

ازل سے تا بہ ابد دائرہ کھنچا ہُوا ہے
حیات رُکتی نہیں خاک میں سمو کر بھی

اگر پسند نہیں ہے مِرا وجود اُسے
تو کیا مِلے گا رفاقت کا بیج بو کر بھی

کسی کے ساتھ یہاں جاگنے سے کیا ہو گا
کہ چین آیا نہیں ہے مجھے تو سو کر بھی

مَیں اپنے آپ کو آزاد کرنا چاہتا ہوں
مگر اسیر ہوں بارِ گناہ ڈھو کر بھی

بحال ہو نہ سکی میری روشنی ساجدؔ
لباسِ زیست فقط آنسوؤں سے دھو کر بھی



☆

فضا خوشبو سے خالی ہو رہی ہے اور گھر تم سے
زمانہ آ گیا ہے جب رہوں گا بے خبر تم سے

یہ مانا مہرباں ہو، نرم دل ہو، خوب سیرت ہو
مگر طے ہو نہ پائے گا محبّت کا سفر تم سے

چلو اچھّا ہُوا یہ داستاں بھی ختم پر آئی
مَیں سمجھا تھا کہ اب نسبت رہے گی عمر بھر تم سے

تمہاری مدح میں رطب اللساں ہوں اور رہوں گا مَیں
کہاں رُخ پھیر سکتا ہے کوئی آئینہ گر تم سے

کوئی خواہش نہیں ہے سینچنے کے واسطے دل میں
یہ نخلِ آرزو بھی اب رہے گا بے ثمر تم سے

دھڑکنے کی اجازت بھی نہیں دوں گا مَیں اب دل کو
اگر اب سامنا ہو گا کسی بھی موڑ پر تم سے

چلے آؤ کسی دن خواب بن کر میری آنکھوں میں
تقاضا کر نہ پائے گی مگر یہ چشمِ تر تم سے

یقیں رکھو یونہی اپنے ہُنر کی تازہ کاری پر
یہ فصلِ نور ہے اور صرف ہو گی بارور تم سے

مِری تقدیر میں بُجھنا لکھا تھا، بُجھ گیا ہوں مَیں
ذرا سی روشنی تھی میرے جیون میں مگر تم سے

عجب دن تھے کہ اپنی موج میں وابستہ رہتے تھے
در و دیوار مجھ سے اور آنگن کے شجر تم سے

کبھی یہ آسماں میری تمازت سے دمکتا تھا
کبھی اس خاک داں پر خلق ہوتی تھی سحر تم سے

کبھی سوچا نہیں تھا بھول جاؤں گا تمہیں ساجدؔ
کبھی یہ دن بھی آئے گا چُراؤں گا نظر تم سے



☆

خواب تھی قربت ہماری، قدر افزائی بھی خواب
خواب تھا میرا تجاوز، اُس کی پسپائی بھی خواب

ڈوبتا ہوں اور کونے سے نکل آتا ہوں مَیں
آئنہ خانے نے کردی فصلِ تنہائی بھی خواب

کیا خبر تھی دائرے میں بھاگتا پھرتا ہوں مَیں
ہو گئی وحشت سرا میں میری یکتائی بھی خواب

یہ فقط میرا گماں تھا دیکھتا ہے وہ مجھے
خواب تھیں اُس گُل کی آنکھیں اور بینائی بھی خواب

ایک تنکا تک نہیں توڑا ہے مَیں نے شام تک
خواب تھی میری فراغت، کارفرمائی بھی خواب

دُور ہوتے جا رہے ہیں جاننے والے مِرے
ہو گئی غربت کدے میں بزم آرائی بھی خواب

اب تلک محفوظ ہوں ساجدؔ مگر ہو جائے گی
عشق کے نرغے میں آ کر میری دانائی بھی خواب

☆

خواب آتے ہیں کہاں ایک زمانے سے مجھے
کوئی نسبت نہیں اب آئنہ خانے سے مجھے

بے سبب ہجر کی دیوار کھڑی کرتا ہے
اور کبھی پاس بُلاتا ہے بہانے سے مجھے

کوئی نگراں ہے مِرے عالمِ بیداری کا
باز رکھتا ہے کوئی خواب چُرانے سے مجھے

غیب سے باغ لگانے کی اجازت مِل جائے
چین ملتا ہے اگر پھول کِھلانے سے مجھے

اُس کی دیوار کے سائے میں پڑا رہتا ہوں
روک رکھّا ہے کسی یاد نے جانے سے مجھے

کوئی آواز بھٹکتی ہے مِرے کمرے میں
کوئی خوشبو ہے جو آتی ہے سرہانے سے مجھے

بھول جانے میں قباحت بھی نہیں کچھ ساجدؔ
اور مِل جائے گا کیا وعدہ نبھانے سے مجھے



☆

نرم لبوں سے گرم زباں تک
رس کی دھارا جسم سے جاں تک

آئینے میں ڈھل جاتی ہیں
کچھ دیواریں فصلِ خزاں تک

لذّت کا دریا بہتا ہے
اُس کے بدن سے کون و مکاں تک

عشق میں کچھ بے سود نہیں ہے
کارآمد ہے کارِ زیاں تک

وصل دوامی قدر ہے صاحب
جا سکتا ہے کون کہاں تک

اُس کے پاؤں کی آہٹ سُن کر
تھم جاتا ہے آبِ رواں تک

اب کچھ ایسا بیت رہا ہے
جس کا نہیں تھا وہم و گماں تک

اُس کی بے مہری کے باعث
سرد پڑی ہے برقِ تپاں تک

اس کی آنکھوں کے چرچے ہیں
کوزہ گراں سے شیشہ گراں تک

گردش میں ساری دنیا ہے
پیمانے سے دورِ زماں تک

ظلمت کی زنجیر ہے ساجؔد
تیغ و تبر سے تیر و کماں تک



☆

اُڑا دیں عشق نے نیندیں ہماری
مگر لازم نہیں اختر شماری

ستارے ہار کر بُجھنے لگے ہیں
ہوئی جاتی ہے سب پر نیند طاری

تری آنکھیں، ترا ماتھا، ترے لب
مَیں سب کو چُومتا ہوں باری باری

کرو جو بھی تمہارے جی میں آئے
ہمیں ہر حال میں لگتی ہو پیاری

کبھی بے چین ہے وہ راحتِ جاں
کبھی بڑھتی ہے میری بے قراری

کہیں مِل جائیں گے پھر آتے جاتے
بہت محدود ہے دنیا ہماری

اُداسی جب فزوں ہوتی ہے ساجؔد
چلی آتی ہے پھر بادِ بہاری

☆

وقت کا زیر و بم سمجھتا ہوں
مَیں اُسے بیش و کم سمجھتا ہوں

آنکھ ہو، آئنہ ہو، آبِ رواں
پانیوں کو بہم سمجھتا ہوں

جن کو ہم راہ لے کے نکلا تھا
آج بھی ہم قدم سمجھتا ہوں

اپنے موجود کی خبر ہے مجھے
وجہِ جور و ستم سمجھتا ہوں

عشق کی کیمیا سے واقف ہوں
اور مزاجِ صنم سمجھتا ہوں



زندگی کے بہت بکھیڑے ہیں
مَیں سبھی پیچ و خم سمجھتا ہوں

آپ کا ہم سفر رہا ہوں مَیں
آپ کو محترم سمجھتا ہوں

آپ تذلیل کر رہے ہیں مِری
مَیں اسے بھی کرم سمجھتا ہوں

کبھی چراغ جلاتا، کبھی بُجھاتا ہوں
مَیں خواب گاہ کی آسودگی بڑھاتا ہوں

مَیں داستاں میں تصرُّف نہیں کیا کرتا
مگر مَیں صرف کہانی نہیں سُناتا ہوں

جہاں قیام کی خواہش ہو اُس پری وش کو
تو اُس نواح میں دنیا نئی بساتا ہوں

مجھے یہ خوف ہے پتّھر میں ڈھل نہ جاؤں کہیں
مَیں سطحِ آب پہ مشکل سے تھرتھراتا ہوں

عجب طرح کا تنوُّع مِرے مزاج میں ہے
کبھی تبر تو کبھی صبر آزماتا ہوں



مِری طرح کوئی گردش میں کم ہی رہتا ہے
کوئی دکھائی اگر دے تو مسکراتا ہوں

گزر رہا تھا تو ٹھک سے مجھے خیال آیا
قریب آیا ہُوا ہوں تو ہو ہی آتا ہوں

کوئی تو وقت مقرّر ہو خود سے مِلنے کا
جو ہو سکا تو کوئی ضابطہ بناتا ہوں

مَیں اپنے آپ سے ناراض ہوں بہت ساجدؔ
سو کچھ دنوں سے مَیں پیتا ہوں اور نہ کھاتا ہوں

☆

وحشتِ دل کا تقاضا ہے کہ گریہ کیجے
زخم کھایا ہے تو اس زخم کا چرچا کیجے

کون کر سکتا ہے انکار کسی پیارے کو
سر کے بل آئیں گے، اِک بار اشارہ کیجے

عکس آئینے کے پیچھے نہیں رکھّا جاتا
بات کہنے کا سلیقہ ہے تو لکھّا کیجے

یہ مِرے خواب ہیں مٹّی میں مِلا دینے کو
یہ مِری خاک ہے، کثرت سے اُڑایا کیجے

کس کو سینے سے لگائیں بڑی تعظیم کے ساتھ
اور اس حال میں کس کس سے کنارہ کیجے



جایئے اور بُھلا دیجئے بُھولے سے ہمیں
دیکھیے اور کسی نقش کو اُجلا کیجے

کیجئے شوق سے جو آپ کے جی میں آئے
چاہتے ہیں مِری تذلیل تو اچھّا کیجے

وہ تجاوز جو مِرے خواب کی تعبیر بنا
کبھی فرصت میں اسے سوچ کے خندہ کیجے

دھوپ میں جلتے ہوئے شیشہ گروں پر ساجدؔ
کبھی در کا کبھی دیوار کا سایہ کیجے

خواب کی دھوپ کہاں ، نیند کی بستی ہے کہاں
جس کے ہونے کی یہ صورت ہے وہ رہتی ہے کہاں

کون دیتا ہے خبر اُس کو گلی کوچوں کی
صبح دم بادِ صبا شہر میں چلتی ہے کہاں

دیکھ لیتا ہوں مَیں اُس گُل پہ نظر پڑتے ہی
برف گرتی ہے کہاں، آگ برستی ہے کہاں

رنگ آ جاتا ہے بستی کے سبھی باغوں میں
صبح دم رات کی وحشت چلی جاتی ہے کہاں

دن نکلتے ہی اُسے آئنہ مِل جاتا ہے
بے کلی رات گئے رنگ جماتی ہے کہاں



لب پہ آ جاتی ہے جو بات نہیں کہنے کی
اور جو کہنے کی حاجت ہے وہ آتی ہے کہاں

شام جو دھوپ چُرا لیتی ہے جاتے جاتے
جمع کرتی ہے کہاں اور اُڑاتی ہے کہاں

کچھ خبر بھی ہے تجھے یار کہ دھڑکن دل کی
ڈُوب جاتی ہے کہاں اور اُبھرتی ہے کہاں

کیا اثر اُس کی طبیعت پہ ہو میرا ساجدؔ
مَیں جو کہتا ہوں اُسے غور سے سُنتی ہے کہاں

☆

ہاتھ میں دشمن کے شاید مَیں کماں دیتا نہیں
اعتماد اُس پر نہ ہوتا تو زباں دیتا نہیں

زہر کی صورت بدن میں پھیلتی جاتی ہے آگ
رات بھر جلتا ہوں لیکن مَیں دُھواں دیتا نہیں

اپنی مرضی سے جیے، اپنی رضا سے مر سکے
اس قدر مہلت کسی کو آسماں دیتا نہیں

کیا سمجھتا مَیں خزاں کو بھی نویدِ فصلِ گل
ذات پر ایقان اگر وہم و گماں دیتا نہیں

ڈھال لیتا ہے کوئی اپنی اُپج سے کائنات
کوئی امکانات کو کون و مکاں دیتا نہیں



راستہ اس حال میں کٹتا نظر آتا نہیں
اور ٹھہرنے کی اجازت ساربان دیتا نہیں

میری تنہائی میں کوئی دخل دے سکتا نہیں
مَیں تجھے بھی یہ سہولت میری جاں دیتا نہیں

منسلک خورشید سے ہے روشنی کا سلسلہ
آئنے کو شمعِ حیرت شمع داں دیتا نہیں

میری آزادی ہے ساجدؔ جان سے پیاری مجھے
اس لیے مَیں غیر کو اپنا نشاں دیتا نہیں

☆

میسّر وہ گُلِ راحت نہیں کیا
کوئی جینے کی اب صورت نہیں کیا

ہمیں تم سے شکایت اب نہیں ہے
تمہیں اس بات پر حیرت نہیں کیا

ابھی تک ہُو کا عالم ہے گلی میں
تمہیں اس بار بھی فرصت نہیں کیا

جہاں پہنچی نہیں کُن کی صدا بھی
وہاں ہونا بھی اِک نعمت نہیں کیا

کسی صورت قریب آ تو گئے ہیں
مگر یہ وصل بے لذت نہیں کیا



چلی آتی ہے دنیا منہ اُٹھائے
تمہیں انکار کی عادت نہیں کیا

پہل کرنے کی خواہش ہے تمہیں بھی
جوابی وار کی طاقت نہیں کیا

بہت شدّت لپٹنے میں ہے ساجدؔ
ہمارے پاس اب مُہلت نہیں کیا

☆

تمہاری یاد سے جب درگزر کِیا مَیں نے
تو ایک رات میں کتنا سفر کِیا مَیں نے

مِرے سِوا بھی کسی اور سے ہے لاگ تمہیں
میں جانتا تھا پہ صَرفِ نظر کِیا مَیں نے

متاعِ وصل پہ تکریم کو فضیلت دی
اگرچہ عشق بہت ٹُوٹ کر کِیا مَیں نے

جبیں سے چاہِ ذقن تک کئی پڑاؤ تھے
یہ فاصلہ بڑی مشکل سے سر کِیا مَیں نے

عطا ہُوا تھا وہ فردوسِ بے بہا مجھ کو
مگر قیام بہت مختصر کِیا مَیں نے



کسی کے نقشِ قدم پر قدم نہیں رکھّا
جو چاہتا تھا وہی عمر بھر کِیا مَیں نے

چراغ وحشتِ ظلمت کی نذر کر ڈالے
کہاں دمیدہ یہ باغِ ہُنر کِیا مَیں نے

ستارے ڈُوب گئے، آئنے تڑپ اُٹھّے
کسی کو چُوم کے جب بارور کِیا مَیں نے

کسی کے قصر کی بنیاد ہی ہِلا ڈالی
یہ کام سہل نہیں تھا مگر کِیا مَیں نے

اِک آسماں تھا جسے خاک کا اسیر کیا
اِک آئنہ تھا جسے بے بصر کِیا مَیں نے

اُتر چکا تھا ہر اِک ذہن سے وہ جب ساجدؔ
تو یاد رکھ کے اُسے معتبر کِیا مَیں نے

☆

اِک شہرِ طرب ناک سے گاتا ہُوا گزروں
آتا ہُوا گزروں کبھی جاتا ہُوا گزروں

تعمیر کروں برف سے دیوارِ تماشا
پتّھر کو مگر راکھ بناتا ہُوا گزروں

جو رنگ دِکھائی نہیں دیتے ہیں، دِکھاؤں
جو غیب سے سُنتا ہوں، سُناتا ہُوا گزروں

ہر بار تجھے خواب دِکھاتا ہوں سَحر کے
اِس بار تری نیند چُراتا ہُوا گزروں

بنیاد رکھوں گھر میں کسی نقش کی صورت
بازار سے زنجیر بجاتا ہُوا گزروں

تجسیم کروں عکس کو آئینے میں ساجدؔ
مٹنے پہ اگر آئے، مٹاتا ہُوا گزروں



☆

لہو میں ڈُوب گیا ہجر کا خُمار اگر
ترے بغیر ہمیں آ گیا قرار اگر

سَحر کو رنگ جمانے کا اِذن مِل جائے
کریں یہ خواب تری نیند پر نثار اگر

اُسے مَیں مسندِ دل پر بحال کر دوں گا
وہ ہو گا اپنے رویّے پہ شرمسار اگر

نئے شگوفے کِھلیں گے نہ پیڑ پھُولیں گے
خزاں کی راہ میں بیٹھی رہی بہار اگر

بحال ہو نہیں پائے گا آدمی کا وقار
نگر سے ختم نہ ہو گی یہ رسمِ دار اگر

کسی کو اپنا بنانے کا دھیان آتا ہے
تو میرے ذہن میں آتے ہیں بے شمار اگر

نہ ہو گی اور کسی چیز کی طلب ساجدؔ
وہ میری بانہوں میں آ جائے ایک بار اگر

☆

گناہ کرتا ہوں اور نیکیاں کماتا ہوں
مَیں ہر طرح کی رفاقت نبھائے جاتا ہوں

عزیز رکھتا ہوں سب یاد رکھنے والوں کو
مگر مَیں بھولنے والوں کو بھول جاتا ہوں

سَحر کے وقت ستاروں کی روشنی چُن کر
کبھی چراغ، کبھی آئنہ بناتا ہوں

ہَوا کا لمس بڑھاتا ہے تازگی میری
شجر نہیں ہوں مگر پھر بھی تھرتھراتا ہوں

کبھی ہے لُطف کا باعث مِرا نہیں ہونا
کبھی مَیں ہونے کے نشّے میں لڑکھڑاتا ہوں

نہیں ہے اُس سے زیادہ کوئی عزیز مجھے
یہ اور بات اسے بھی بہت ستاتا ہوں

وہ چُوم لیتی ہے بارِ دگر مجھے ساجدؔ
مَیں گہری نیند میں جس وقت کسمساتا ہوں



☆

محفل میں اُس چراغ کی آیا ہُوا تھا مَیں
کیا کہہ دیا کسی نے کہ خود سے خفا تھا مَیں

آیا نہ خوف لمعۂ خورشید سے مجھے
کیوں اِک دیے کو دیکھ کے گھبرا گیا تھا مَیں

وہ تو سُپردگی کے لیے بے قرار تھی
سچ یہ ہے اپنی وجہ سے پیچھے ہٹا تھا مَیں

تمجید کر رہے تھے سبھی عکس صبح کی
جو آئنے میں بند تھا وہ بے نوا تھا مَیں

پھر یہ ہُوا کہ اس سے مجھے عشق ہو گیا
اس سانحے سے پیشتر اچھّا بھلا تھا مَیں

وہ ہنس پڑی تو پھر سے مِری سانس چل پڑی
کچھ دیر کو تو واقعی گھبرا گیا تھا مَیں

کوئی مِرے لیے بھی دعا کر رہا تھا کیا
جب اِک پری کے واسطے محوِ دعا تھا مَیں

جس نے خود اپنے آپ کو معزول کر دیا
وہ بادشاہِ وقت، وہ فرماں روا تھا مَیں

شاید کہا تھا آپ نے ''کچھ بات کیجیے''
اس بات کے جواب میں کچھ کہہ رہا تھا مَیں

جس کو بہت یقین تھا میرے وجود پر
مَیں نے اُسے رُلا دیا، کتنا بُرا تھا مَیں

نسبت ذرا سی تھی مجھے کنعاں کے چاند سے
ہر چند شاہِ مصر نہ ملکِ خطا تھا مَیں

مَیں اپنے آئنے کو دِکھائی نہیں دیا
کیا جانیے فراق میں کیا ہو گیا تھا مَیں

ساجدؔ مَیں اپنے وقت کا سیف الملوک تھا
سوتا کہیں تھا اور کہیں جاگتا تھا مَیں



☆

روشنی سہمی ہوئی، آئنہ پتّھرایا ہُوا
کون اِس بار مِرے خواب میں ہے آیا ہُوا

اب کسی طرح کروں اپنے تشخّص کو بحال
اُس کے سایے میں رہوں گا یونہی گہنایا ہُوا

اُس کے دروازے پہ دن رات پڑا رہتا ہوں
مَیں کبھی شرم سے عاری کبھی شرمایا ہُوا

عشق سے خلق کیا جس نے مجھے، اُس نے ہے
کارِ دُنیا میں مِری ذات کو اُلجھایا ہُوا

اب کوئی داغ نہیں ہے مِری تنہائی پر
رات آئی تو جُدا مجھ سے مِرا سایا ہُوا

اُس نے آنکھوں سے کیے گھر کے اندھیرے مسدود
اور سانسوں سے ہے اِک باغ کو مہکایا ہُوا

اُس کے قدموں سے لپٹ جاتے ہیں باری باری
گھاس لہرائی ہوئی، راستہ لہرایا ہُوا

بعض اوقات اُسے تنگ کِیا کرتا ہوں
اور کبھی خود سے اُلجھ پڑتا ہوں تڑپایا ہُوا

لوگ تسلیم کریں گے بڑی تحقیق کے بعد
مُستند ہو بھی اگر آپ کا فرمایا ہُوا

شمع جلتی ہے کہیں یاد کے ویرانے میں
سانس لیتا ہے کہیں گیت کوئی گایا ہُوا

نیند میں چلتے ہوئے رات گُزاری اُس نے
اور بستر پہ کوئی پُھول ہے مُرجھایا ہوا

ذہن اُلجھا ہُوا موجود کے اُلجھاوے میں
جسم آلام کی شدّت سے ہے بل کھایا ہُوا

ہم نے آنکھوں پہ لگا رکھّی ہے قدغن ساجد
اور ہے دِل کو بہت دیر کا سمجھایا ہُوا



☆

دوڑتی ہے اُس کے ماتھے پر اگر کوئی لکیر
نقش ہو جاتی ہے پانی پر سفر کرتی لکیر

مائلِ پرواز جب ہوتا ہے کاجل آنکھ کا
آئنے کو گدگداتی ہے تبسّم کی لکیر

اور تیکھی ہو گئی ہے بوسۂ شیریں کے بعد
نرم ہونٹوں کے کناروں کی وہ شرمیلی لکیر

ریشمی گردن کی گولائی سے ہو کر شاد کام
رقص کرتی ہے کہیں سیماب پا وحشی لکیر

سرکشیدہ گُنبدوں کے بیچ سے ہوتی ہوئی
ناف کے پیالے میں سو جاتی ہے اِک سیدھی لکیر

ارغوانی کینوس پر جھومتے گاتے چراغ
ریشمی کُرّوں میں سر دیتی کوئی ننھّی لکیر

آگ برساتا ہے جب بھی وصل کا آتش فشاں
سر چُھپا لیتی ہے ندّی میں کوئی پیاسی لکیر

سانس لینے سے بدل جاتی ہے اُس کی کیمیا
دیکھتا رہتا ہوں مِٹتی اور کہیں بنتی لکیر

کس میں ہمّت تھی کہ میرے راستے میں آ سکے
اُس نے جب میرے تجاوز پر نہیں کھینچی لکیر

ڈوبتے ہی پھر اُبھر آتی ہے سطحِ آب پر
اپنی رو میں بہہ رہی ہے جھومتی گاتی لکیر

رنگ تھے یا آئنہ بردار پھرتے تھے غلام
رُک گئی بہرِ تماشا جسم پر بہتی لکیر

شعر کہتا ہوں تو ساجدؔ سانس لے پاتا ہوں مَیں
کھینچ دوں کیا اس سہولت پر مَیں تعزیری لکیر